کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد حیدرآباد

Volume:12 Issue:9 September 2019

مدیر

مولانا محمد عبد القوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.idara.info

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

دانش مندی کے دو تقاضے ''دعا، تدبیر''

مولانا محمد عبد القادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾

(سورۃ الانفال)

ترجمہ: اور (اے پیغمبر!) اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ اِن کو اس حالت میں عذاب دے جب کہ تم ان کے درمیان موجود ہو، اور اللہ اس حالت میں بھی عذاب دینے والا نہیں ہے جب وہ استغفار کرتے ہوں۔

تشریح: قرآن مجید کی کئی آیات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال اور ان کی دعاؤں کے بڑے قدرداں ہیں۔ جو توبہ بھی صدق دل، احساسِ ندامت، اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ کی جاتی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس توبہ اور دعا کو ضرور قبول فرماتے ہیں۔ اگر دعا کی جارہی ہو اور اس کی قبولیت کے اثرات ظاہر نہ ہو تو اس میں ہمارے خلوص، احساس ندامت، آئندہ نہ کرنے کے عزم میں کسی قسم کی کمی یا جھول ہے، اسی وجہ سے بارگاہ ایزدی میں یہ توبہ قبول نہیں ہو رہی ہے اور دعائیں رد ہو رہی ہیں ورنہ تو برسوں کے پاپی اور گنہگار کو اللہ تعالیٰ یکلخت معاف فرمادیتے ہیں۔ ایسی بیشتر مثالیں تاریخ میں ہمیں ملتی ہیں۔

ہم مسلمان اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں ہمارے ساتھ ظلم وزیادتی کا جو ننگا ناچ ہو رہا ہے مسلمان سوئے آسمان نگاہ کرتا ہے، دعائیں مانگتا ہے، فریاد کرتا ہے لیکن نہ اس کی توبہ قبول ہو رہی ہے نہ دعائیں قبول ہو رہی ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال آج ہر مسلمان کا ہے، ہر غمگین بندہ کا ہے کہ ہم دعائیں مانگتے ہیں لیکن احوال سدھرنے کو ہے نہ ظلم وزیادتی کا سلسلہ ختم ہونے کو ہے، اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں:

پہلا جواب تو یہ ہے کہ توبہ، استغفار اور انابت الی اللہ کے لئے جو شرائط ضروری ہیں ہم مسلمانوں میں ان کا

---

*استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ ہذا

فقدان ہے، نہ ہم استغفار خلوص دل شعور و آگاہی سے کرتے ہیں نہ گناہوں سے معافی احساسِ ندامت اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ مانگتے ہیں۔ ہمارا استغفار کیسا استغفار ہے؟ ہماری توبہ کیسی توبہ؟ اور پھر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد احکامِ شرع سے غافل ہے اگر اجتماعی شکل میں اللہ تعالیٰ کی نصرت آئے تو کیسے آئے؟ اور دعاؤں کے اثرات ظاہر ہوں تو کیسے ہوں؟

دوسرا جواب یہ ہے کہ مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو چکے ہیں ایک کا ایمان اس کی تدبیر پر ہے اور ایک ایمان صرف دعا پر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ صرف دعا یہ بھی ناکافی ہے اور صرف تدبیر یہ بھی ناکافی ہے۔ نبی پاک ﷺ کے اسوہ میں ہمیں دونوں باتیں ملتی ہیں کہ آپ ﷺ دعا بھی فرمایا کرتے تھے اور تدبیر بھی اختیار کیا کرتے تھے نبی پاک ﷺ کا ہجرت کے موقع پر اپنے وطن سے نکلنا اور ایک غار میں جا کر روپوش ہونا اور کبھی جنگی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے راستہ تبدیل کر کے میدان جنگ تک پہنچنا اور کبھی اپنے ہاتھوں سے مٹی اٹھا کر پھینکنا اور کبھی تلوار اٹھانا اور کبھی صحابہ کرامؓ کو میدان جنگ میں گھس پڑنے کا حکم دینا یہ ساری وہ باتیں ہیں جو تدبیر سے تعلق رکھتی ہیں۔

حضرت عمرؓ کے ایمان کے لئے کعبہ کا غلاف تھام کر اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا، جنگ بدر کے موقع پر اپنی پیشانی کو خاک پر رکھ کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرنا، راتوں میں اٹھ کر اپنی امت کی کامیابی اور نصرت و ہدایت کے لیے رونا اور بلبلانا یہ باتیں وہ ہیں جن کا تعلق دعا سے ہے اگرچہ مکی دور کے اندر نبی پاک ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نہتے اور کمزور تھے اور اللہ تعالیٰ اسباب کے توسط سے نبی پاک ﷺ کو اسلام کو اور مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمانا چاہتے تھے اس لئے تیرہ سالہ مکی زندگی میں حکم ملا تو یہی ملا کہ دعائیں کریں نماز اور صبر کے ذریعے مدد طلب کریں لیکن جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف آوری ہوئی تو وہاں پر نبی پاک ﷺ نے دعاؤں کا بھی اہتمام فرمایا اور تدبیر و حکمت عملی بھی اختیار کی صرف تقدیر پر راضی رہ کر ہاتھ باندھے نہیں بیٹھے بلکہ تدابیر کو بھی اختیار کیا اور دعاؤں کا اہتمام بھی فرمایا۔

جب کبھی مسلمانوں پر مصائب و آلام اور مظالم آتے ہیں تو اوراد و وظائف کا اور دعاؤں کا سلسلہ چل پڑتا ہے، دعا عبادت بھی ہے بلکہ اصل عبادت اور موثر عبادت ہے لیکن ہم ذرا غور کریں کہ یہ کارخانۂ ہستی دو چیزوں پر چل رہا ہے ایک تقدیر ہے اور ایک تدبیر ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ ہمیشہ تدبیر پر تقدیر ہی کا غلبہ ہوتا ہے اس کے باوجود ہمیں حکم ملا ہے کہ تدبیر اختیار کریں ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ ہم جہاں خدا تعالیٰ کے فیصلوں اور اس کی تقدیر پر راضی بہ رضا رہیں وہیں منظم منصوبہ بند انداز میں اپنی حکمت عملی کے ذریعہ۔۔۔ (بقیہ صفحہ: ۸ پر)

امت میں پیدا ہونے والے فتنے

حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ

عَنْ اَبِیْ ھریرۃ رضی اللہ عنہ : قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: یَتَقَارَبُ الزَمَانُ وَیُقْبَضُ العِلْمُ وَتَظْھَرُ الفِتَنُ وَیُلْقَی الشُّحُّ وَیَکْثُرُ الْھَرَجُ، قَالُوْا وَمَا الھَرَجُ ؟ قَالَ القتلُ . (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: (وقت آئے گا) زمانہ قریب قریب ہوجائے گا، اور علم اُٹھالیا جائے گا اور فتنے نمودار ہوں گے، اور (انسانی طبیعتوں اور دلوں میں) بخل ڈال دیا جائے گا، اور ہَرَج بہت ہوگا، صحابہؓ نے عرض کیا ہرج کا کیا مطلب؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: (اس کا مطلب ہے) کُشت وخون۔

تشریح: اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُمت میں پیدا ہونے والے چند فتنوں کے بارے میں آگاہی دی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اِن الفاظ میں ارشاد فرمائی: ''یتقارب الزمان'' شارحین نے اس کے متعدد مطلب بیان کئے ہیں، اس عاجز کے نزدیک اُن میں قریب الفہم یہ ہے کہ وقت میں برکت نہ رہے گی، جلدی جلدی گذرے گا، جو کام ایک دن میں ہوجانا چاہیئے وہ کئی دن میں ہوسکے گا، راقم سطور کا تو یہ ذاتی تجربہ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ علم اُٹھالیا جائے گا، مطلب یہ ہے کہ علم جو نبوت کی میراث ہے وہ اُٹھالیا جائے گا، ایک دوسری حدیث میں اس کی وضاحت اس طرح فرمائی گئی ہے کہ علماءِ ربانی (جو اس علم کے وارث ہیں) اُٹھالئے جائیں گے (چاہے کتب خانے باقی رہیں اور پیشہ ور عالموں سے ہماری بستیاں بھری رہیں) حقیقت یہ ہے کہ علم جو نبوت کی میراث اور جو ہدایت اور نور ہے، وہ وہی ہے جس کے حامل اور امین علمائے ربانی ہیں ـــــــــ جب وہ باقی نہیں رہیں گے اور اُٹھالئے جائیں گے تو وہ علم اور نور بھی اُن کے ساتھ اُٹھ جائے گا۔

تیسری بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی "اور طرح طرح کے فتنے نمودار ہوں گے" یہ بات کسی توضیح و تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

چوتھی بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشا فرمائی " ویلقی الشح " مطلب یہ ہے کہ سخاوت وفیاضی اور ایثار جو صفات محمودہ ہیں وہ لوگوں میں سے نکل جائیں گے اور اُن کے بجائے ان کی طبیعت میں بُخل جو ایک منحوس رذیلہ ہے ڈال دیا جائے گا۔

آخری بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ کُشت وخون کی گرم بازاری ہوگی، جو دنیا کے لحاظ سے بھی افراد اور اُمتوں کے لئے تباہ کُن ہے اور آخرت کے لحاظ سے بھی گناہِ عظیم۔

ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " کُشت وخون کے زمانے میں عبادت میں مشغول ہو جانا ایسا ہے جیسا کہ ہجرت کر کے میری طرف آجانا"۔ یعنی جب ناحق کُشت وخون کی گرم بازاری ہو تو مومن کو چاہیئے کہ اپنا دامن بچا کے اور یکسو ہو کے اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جائے۔ اُس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسا ہوگا جیسا کہ اپنا ایمان بچانے کے لئے دارالکفر سے ہجرت کر کے میری طرف آجانا۔

(معارف الحدیث: ۸/ ۱۴۴)

(بقیہ صفحہ: ٦ سے)

پرامن طور پر اسباب کو اختیار کریں؛ تا کہ اعتدال وتوازن برقرار رہے۔ دشمن کے حربوں پر نظر رکھنا، مکاریوں کو سمجھنا، ان کی منصوبہ بندیوں سے واقف ہونا، ہر فیصلے کے پیچھے والی حقیقت سے آشنا ہونا اور اپنی صفوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنا یہ انتہائی ضروری اور اہم چیز ہے۔ ذرا ہم دیکھیں کہ دشمن نے ہمارے خلاف جنگ کے کتنے نوع بہ نوع محاذ کھول رکھے ہیں، اپنے اندر اختلافات کے باوجود صرف ایک محرک یعنی اسلام دشمنی انہیں متحد اور متفق بنا رکھی ہے ان کے عقائد مختلف ہیں، رجحانات اور نظریات الگ ہیں، عبادتوں کا طریقۂ کار الگ ہے، مقاصد جداگانہ مفادات ایک دوسرے سے ہٹ کر ہے، ان تمام تضادات کے باوجود متحد اور اسلام دشمنی مسلم دشمنی پر متفق ہیں۔ کیا یہ تمام چیزیں ہمارے لیے درس عبرت نہیں ہیں؟ ہم کو ان چیزوں سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور ناموافق حالات کے موقع پر جہاں دعا واستغفار اوراد وظائف کا اہتمام کرنا چاہیے وہیں پر اسبابِ نافعہ مؤثر حکمت عملی کو بھی اختیار کرنا چاہیے اور سب کو مل کر ایک کامیاب قیادت بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت زار پر رحم فرمائے، خصوصاً ہمارے اس ملک میں امن وامان کی صورتیں پیدا فرمائے۔ آمین

پیش گفتار

مسلمانوں کے بدلتے ہوئے حالات میں دعوتِ دین کے جدید تقاضے

از: مدیر

سب سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ راقم عصری علوم سے بالکل نا آشنا ہے، ایک دن کے لیے بھی اسکول ایجوکیشن میں داخل نہیں کیا گیا، کیوں کہ والد ماجد عصری تعلیم کے اعلی مراحل میں دینی تعلیم کی طرف مائل ہوئے تھے اور محض قرآن کریم کی محبت اور اس کو سمجھ سکنے کے شوق میں میڈیسن کی تیاری چھوڑ کر قرآن کریم حفظ کیا، موقوف علیہ تک درسیات کی تکمیل کی، چودہ برس تک حضرت محی السنہؒ کی صحبت میں رہے، اُنہی کی ہدایت پر اور تجویز کردہ خاندان میں نکاح کیا جو علماءِ دیوبند اور تھانویُ المشرب خاندان تھا، اس عاجز نے اسی میں آنکھیں کھولیں بیس بائیس سال کی عمر تک سوائے دینی تعلیم کے اور کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، سوائے علماء و مشائخِ دیوبند کے کسی کو دیکھا نہ جانا، جو کچھ میری معلومات ہیں وہ یا تو درس نظامی کی پڑھی ہوئی کتب سے یا علماء و صلحاء کی صحبتوں سے حاصل شدہ ہیں؛ حق تعالیٰ شانہٗ نے عنفوانِ شباب ہی سے تدریسی خدمات کا اور شہر کے پڑھے لکھے لوگوں کی ایک مسجد میں امامت وخطابت کا موقع عنایت فرمایا؛ اگر چہ بساطِ صلاحیت بہت محدود تھی اور ہے؛ لیکن کام لینے والے مالک نے اپنی قدرت ونصرت سے بہت کام لیا ہے اور لے رہا ہے، جس کا شکر مجھ پر لازم ہے۔

میں اپنے گھرانے کے مخصوص ماحول کی بنا کبھی اسکول نہیں گیا نہ کبھی دل میں اس کا داعیہ اور شوق پیدا ہوا، جب کہ ددھیال میں سب لوگ عصری تعلیم یافتہ تھے اور ننھیال علماء وحفاظ پر مشتمل تھا، یہ تفصیل خودنمائی کے ارادے سے نہیں بلکہ اگلی سطور میں جو اظہارِ خیال کرنے جا رہا ہوں اس کے بارے میں قارئین کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لئے لکھ دیا ہوں کہ شاید میں یہ سب کچھ علوم عصریہ کے حاملین سے مرعوب ہو کر یا اپنے محروم

ہونے کے احساس سے متاثر ہو کر اور پچھتا کر کہہ رہا ہوں، کیوں کہ اب ہمارے ماحول میں کسی کی بھی رائے پر سنجیدہ غور کرنے سے قبل ہی نیت کی خرابی اور فکر کی گمراہی کا فیصلہ کرلیا جاتا ہے؛ الحمد للہ تعالیٰ میں اپنے اکابر سے، اور مسلک علمائے دیو بند سے عقیدہ وفکر میں پوری طرح مطمئن اور ممکن حد تک متبع ہوں، اسی کا داعی ہوں اور اسی پر جینا اور مرنا پسند کرتا ہوں، تاہم یہ بھی انہی سے سیکھا اور سمجھا ہوں کہ کام مقصود ہے طریق مقصود نہیں ہے، حالات بدلتے ہیں تو احکام بدلتے ہیں (جو بدل سکتے ہیں) ذرائع اور مقاصد میں فرق نہ کرنا اور مقاصد کی طرح ذرائع کو بھی ناقابل تبدیل سمجھنا اسی پر اصرار کرنا میرے اپنے محدود مطالعے اور مشاہدے نے اکابر کے علم وعمل میں نہیں پایا، اس کے برخلاف ان لوگوں کو حدودِ عقل وشرع کے اندر وسیع النظر اور زمانے وعلاقے کے تقاضوں کو سمجھ کر کام کرنے والا پایا اسی کی روشنی میں اس وقت میں اپنا مدعا ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

بات دراصل یہ ہے کہ جب تک اپنے ماحول میں تھا پڑھتا پڑھاتا تھا تب تک کسی وسوسے کے درجے میں بھی مدارس کے تعلیمی نظام ونصاب میں کسی ترمیم وتبدیل کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا بلکہ ایسی باتیں کرنے والوں سے بھی وحشت محسوس کرتا تھا، لیکن جب میں اپنے مقدّس اور قابلِ قدر ماحول کے باہر قدم رکھا، عوام کے ساتھ اختلاط ہوا، دعوتی اور تبلیغی ارتباط بڑھا، اُن کے دن بہ دن دین سے دوری کے اسباب کو سمجھنے کے مواقع ملے تو میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی اکثریت بلکہ نوّے فی صد طبقہ اسلام کے تئیں اچھے جذبات رکھتا ہے مگر اسکول ایجوکیشن اور مشنری تعلیم کے ماحولوں نے انہیں علمِ دین وعلماءِ دین اور مراکزِ دین سے بہت دُور کر دیا ہے، اُن کے سینوں میں نورِ ایمان موجود ہے مگر ماحول کی گرد میں دبتا اور چُھپتا جا رہا ہے۔

میں نوجوان تھا بستی کے نوجوانوں کو میں نے قریب کیا، انہیں بے تکلفی کے ذریعہ اپنے سے مانوس کرلیا، بیسیوں نوجوان میرے ساتھ مسجد میں بیٹھنے لگے، دن میں وہ کالج جاتے تھے، میں مدرسہ میں پڑھاتا تھا، رات میں دونوں آزاد تھے، عشاء کے بعد سے ایک ایک دو دو بجے تک ہماری محفل جمتی تھی، میں اُنہیں دین کی باتیں بتاتا تھا وہ بہت شوق سے سُنتے تھے، میں احکام بتاتا تھا وہ قدر سے لیتے تھے اور شوق سے عمل کرتے تھے، میں نے بفضلہٖ تعالیٰ اُن کے عقیدے درست کیے، توحید ورسالت سے مانوس کیا، اپنے اکابر کا عشقِ رسول ﷺ دکھایا، اُنہوں نے غور سے دیکھا، شوق سے مُناسب کچھ قبول کیا، کوئی اِباء وانکار نہ تھا، لاعلمی کا اعتراف اور اب تک نہ جان سکنے کا افسوس اُن کی زبانوں پر تھا؛ یہاں تک کہ محلّے کی فیشن ایبل لڑکیاں جو سرِ شام گلی کوچوں میں چہل قدمی کرتی گھومتی تھیں میں نے اُنہیں چند گھرانوں میں جوڑا، قرآن کے احکام اور احادیثِ رسول ﷺ

سُنا کر اُن کی غیرت کو جھنجوڑا، وہ نادم ہوئیں اور کچھ ہی دِنوں میں بستی کے یہ مناظر ختم ہوئے، وہ حجاب پسند ہوئیں، نمازوں کی پابند بنیں، قرآن کریم تجوید سے سیکھا، اُن کی قدردانیاں بڑھتی رہیں تو میری قربانیاں بھی اُن کے لئے مزید ہوتی رہیں۔

اِن لڑکوں اور لڑکیوں کی بڑی تعداد آج مختلف ملکوں میں ہے، بچیاں بیاہ کے سُسرالوں میں چلی گئیں، بچے نوکریوں کی تلاش میں بیرونِ ملک چلے گئے، اُن کا مجھ سے اب بھی کچھ نہ کچھ تعلق ہے: امریکہ، کینڈا، اسٹریلیا، انگلینڈ، دُبئی، سعودی عرب وغیرہ سے جب کبھی رابطہ کرتے ہیں تو اُن مجلسوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی برکت سے فکری سداد اور اخلاقی سلامتی کا اقرار کرتے ہیں، جہاں میں جاسکا اور اُنہیں دیکھ سکا تو عمل کو قول کے مطابق پایا، بعض لڑکیاں تو یہاں تک کہتی ہیں کہ انہی مجالس کی برکت سے آج ہم اپنے بچوں کو اِن مخالف اسلام ومخربِ اخلاق ماحولوں میں بھی قرآن سکھا لئے ہیں، اور عقیدہ وعمل کا پابند رکھے ہوئے ہیں، گذشتہ پچاس سالوں میں عرب میں غیر مقلدین نے ہر آنے والے نوجوان کا ذہن خراب کیا مگر ان مجلسوں میں بیٹھنے والے بچوں میں شاید ہی کوئی متأثر ہوا ہو، اس لئے کہ ذہن بنے ہوئے تھے اور پہلے سے حق بات سمجھے ہوئے تھے۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے! میری ابتدائی عوامی خدمات کا یہ خوش گوار اور ہمت افزا منظر جو آج سے کوئی چالیس سال قبل نظر آیا تھا وہ دس پندرہ برس سے زیادہ نہ رہ سکا، میرے مصلیوں میں اب بھی نوجوان تھے، محلے میں اُن سے زیادہ تھے، اکثر نوجوانوں کو نہ نمازوں سے دلچسپی تھی نہ امام سے تعلق، جو مسجد آرہے تھے وہ نماز کے بعد کسی کو نہیں پہچانتے تھے، جو بیٹھ جاتے وہ کچھ سمجھ نہیں پاتے تھے، میں نے ان کے لئے مکتب قائم کیا، بچے بہت کم آتے تھے، بار بار مسجد کمیٹی گشتیں کرتی اور ماں باپ کو ترغیبیں دیتی مگر رجحان کم تھا، سب لوگ پڑھے لکھے اور مرفہ الحال تھے مگر دین کا جو ذوق میں نے اُس وقت دیکھا تھا وہ اب نظر نہیں آتا تھا، مزاجوں میں کافی تبدیلی تھی، تعلیم بالغان بھی شروع کیا، مگر موجودہ نوجوانوں نے اس میں کچھ دلچسپی نہ لی، پہلے نوجوان کہیں بیٹھے ہوئے مجھے گذرتا دیکھ لیتے تو اُٹھ کر کھڑے ہوجاتے تھے، کوئی سگریٹ پیتا ہوتا میں اُدھر نکل آتا تو ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر لیتے یا جلدی سے پھینک دیتے تھے، مگر اب اسی ڈھٹائی سے بیٹھے رہتے اور اُسی جرأت سے کشیں مارنے لگے تھے، طبیعتوں اور اخلاق میں یہ تبدیلی میرے دیکھتے دیکھتے تیزی سے بڑھنے لگی تھی، پھر اسی بستی میں جس کا کچھ ذکر میں نے اوپر کیا ہے لڑکیاں سرِ عام گھومنے لگیں اور نوجوان فیشن اور فضولیات کے عادی دکھائی دینے لگے، جو محبت اور اُنسیت امام مسجد سے کل کے نوجوانوں کو تھی آج کے نوجوانوں میں نہ تھی، حد یہ ہے کہ اچھے خاصے مہذب گھرانوں کی لڑکیوں کے بارے میں وہ خبریں ہیں جو ناگفتہ بہ ہیں!

میں نے حالات کے اس تغیر کا جائزہ لینا شروع کیا، دس پندرہ سال کی عوامی خدمات کے بعد تجربات اور تعلقات دونوں میں اضافہ ہوگیا تھا، ہر زاوئے سے غور کیا اور سوچا تو اس انجام پر پہونچا کہ یہ بچے تو انگلش میڈیم اسکولوں کے ماحول سے متاثر ہیں ہی اِن کے والدین بھی اسی عفریت کے ڈسے ہوئے ہیں، پہلے اثر اِکہرا تھا اب نشہ دوآتشہ ہوگیا ہے، اقبال مرحوم نے کہا تھا۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

یہ الحاد اقبال کو تو آنے کے بعد نظر آیا مگر علماءِ ربانیین کو آنے سے پہلے ہی نظر آگیا تھا، انہوں نے بتلا دیا تھا مگر ہَوا کے رُخ پر چلنے والوں اور دریا کے دھارے میں بہنے والوں کو نہ جب سمجھ میں آیا تھا نہ اب سمجھ میں آرہا ہے، اس لئے کہ جب نظر سے فراستِ ایمانی سلب ہوگئی اور دماغ پر تہذیبِ نو کا جادو چل گیا تو ٹیڑھا سیدھا نظر آنے لگا اور سیدھا ٹیڑھا دکھائی دینے لگا؛ بہ قول مولانا گیلانیؒ کے: دجالی نظام کی خاصیت ہی دجل وفریب ہے، وہ دماغوں کو ٹیڑھا کر کے رکھ دیتا ہے، پھر اس میں سیدھی بات نہیں اُترتی۔

خیر! علماء سر پھوڑتے رہے اور مغز مارتے رہے کہ علم وفن سے کوئی بیر نہیں، ان کے ذریعہ جو نظر وفکر کا انقلاب لایا جارہا ہے وہ اپنے دین اور اپنی تہذیب کے لئے سمِ قاتل ہے مگر لوگوں کو نہ سُننا تھا نہ سُنا، بے سُنے سمجھے ہی علماء کو دقیانوس، حالاتِ زمانہ سے بے خبر اور تنگ نظر کہہ کر بچوں کو کرسچن مشنری کی اس جہنم میں جھونکتے رہے، انجام کار اب تیسری نسل کرسچن مشنری کی زہر خوردہ ہمارے سامنے تھی، اس قدر خطرناک تبدیلی کی وجہ مجھے سمجھ میں آگئی، وہ یہ کہ یہ انقلاب اچانک نمودار نہیں ہوا، یہ اُوپر سے بدلتے آرہے نظریات کا اور کرسچن مشنریز کے تحت چلنے والے اسکولوں میں تعلیم کا نتیجہ ہے، پہلی نسل دنیا کے ساتھ دین کا بھرم رکھنے میں پھر بھی کچھ کامیاب تھی، دوسری نسل دین کا نام لیتی رہی اور کسی درجے میں احترام بھی کرتی رہی، مگر دین کی حقیقت سے نابلد ہوگئی، تیسری نسل سرے سے دور ہوگئی بلکہ بعض تو نفور ہوکر رہ گئے۔

جب یہ پتہ چل گیا کہ مسلم بچوں کی اس دین سے دوری اور خدا بیزاری کا بنیادی اور اصلی سبب انگریزوں کا مسلط کردہ ایجوکیشنل سسٹم ہے تو میں نے سوچا کہ اِن محروم ومظلوم نوجوانوں کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے اگلی نسل کو اس نظامِ تعلیم سے بچانا ضروری ہے، میں نے اپنے بیانات وخطباتِ جمعہ میں عصری تعلیم کی خوب مخالفت کی اور مسلمانوں کو جم کر جھنجوڑا، لیکن جن لوگوں کا یہ ذہن بن چکا تھا کہ اسکول ایجوکیشن ہی مسلمانوں کے مصائب ومسائل کا واحد حل ہے اور اسی کے ذریعہ اپنی پس ماندگی وفلاکت دور کی جاسکتی ہے، ان کو تو میری یہ باتیں

مجذوب کی بڑ اور مُلّا کی دقیانوسی و کوتاہ نظری لگ رہی تھیں، البتہ کچھ کچھ بھلے مانسوں کو سمجھ میں آرہی تھیں، وہ مجھ سے سوال کرتے کہ ہم بچوں کو مشنریز سے نکال لیں گے لیکن مولانا! پڑھانا تو ہے نا! آپ ہی بتلائیں کہ آخر کہاں پڑھائیں؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، میں کوئی متبادل پیش نہیں کرسکتا تھا کہ جہاں پر مذاہبِ اسلام اور تہذیبِ اسلامی کے تحفظ کے ساتھ عصری تعلیم کا بہتر بندوبست ہو؛ حیدرآباد میں مسلمانوں کے اسکول بہت تھے، اطراف واکناف ہی میں متعدد اسکول چل رہے تھے، میں نے خود جاکر انہیں دیکھا اور جاننے والوں سے معلوم کرتا رہا تو پتہ چلا کہ یہ اسکول ہیں تو مسلمانوں کے تحت نگران میں اور مشنری اسکولوں میں نظام ونصاب کے اعتبار سے بھی اور کلچر وتہذیب کے لحاظ سے بھی ـــــ سوائے اس کے کہ وہ کرسچنوں کے ماتحت تھے یہ مسلمانوں کے زیر انتظام ـــــ کوئی اور فرق نہیں ہے، کیوں کہ یہ اسکول چلانے والے اگرچہ مسلمانوں کے ہم دَرد اور خیر خواہ ہیں لیکن وہ بھی اسی سانپ کے ڈسے ہوئے، اُن کا یقین بھی اسی تعلیم اور اسی کلچر میں کامیابی پر بنا ہوا ہے یا پھر وہ تجارت اور ذریعہ آمدنی کے لئے اسکول کھولے ہوئے ہیں، انہیں اُمت کے نفع وضرر سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

میں نے چند تعلیم یافتہ اور دین پسند مصلیوں کو لے کر (پچیس سال پہلے کی بات ہے) انگلش میڈیم اسکولوں کے متعدد ذمہ داروں سے بات کی، انہیں مسلم بچوں کے دین وایمان بچانے کے لئے کچھ کرنے کو کہا، بعض نے اتفاق کیا اور نصاب کی راہنمائی کرنے کی ذمہ داری سونپ دی، بعض نے صاف کہہ دیا کہ یہ سب اسکولوں میں ممکن نہیں، اس سے ہمارا کام خراب ہوجائے گا، ماں باپ کو گھروں ہی میں اس کی فکر کرلینی چاہیئے، بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ نورانی قاعدہ پڑھا رہے ہیں، کچھ دعائیں حدیثیں رٹا رہے ہیں، مگر اندازہ یہ ہوا کہ یہ تھوڑا سا احساس اگرچہ قابلِ قدر ہے مگر بالکل غیر منظم ہے اور مقصد کے حصول کے لئے ناکافی ہے۔ اکثر لوگوں کا چوں کہ یہی خیال تھا کہ اس آگ پانی کا جمع ہونا ناممکنات میں سے ہے، اسلئے دل میں داعیہ ہوا کہ مجھے خود ایسا اسکول قائم کرکے ان لوگوں کو عملاً قائل کرادینا چاہیئے کہ بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دیتے ہوئے بھی ایمان واسلام کی تربیت دی جاسکتی ہے، پر یہ کام بڑے سرمائے اور دونوں لائن کی قابلیت کا محتاج تھا، اس لئے بہت سے دین پسند مال داروں کو اس جانب توجہ دلایا، بیانوں میں اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی، لوگ ضرورت کو تسلیم تو کرتے مگر آمادہ پھر بھی کوئی نہ ہوتا تھا۔

اتفاق سے ایک دفعہ بعض معاصر علماء کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو چھڑ گئی تو ان حضرات کو خود اس سلسلے میں متفکر اور ہم خیال پایا، سرمائے کے اسباب کے لئے انہوں نے وعدہ کیا، محنت اور عملی جد وجہد کے لئے میں

تیار ہو گیا، طئے یہ پایا کہ چوں کہ اس اسکول کو ایک نمونہ بنانا ہے اس لئے وسیع پیمانے پر اور عمدہ انداز میں کام ہونا چاہیئے، چناں چہ سب سے پہلے مقاصد طئے کر کے اور عملی خاکہ بنا کر مرشدی حضرت محی السنہؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور اجازت و توجہ کی درخواست کی گئی، حضرت محی السنہؒ نے تمام مضمون کو پڑھ کر یہ تحریر فرمایا: ’’بہت ضروری کام ہے؛ بارک اللہ و تقبل اللہ‘‘ اس جواب کو پڑھ کر گو یا یوں لگا جیسے ساری دنیا متفق ہو گئی، اپنے ان رفقاءِ کرام کے ساتھ فوراً کام شروع کر دیا گیا، وسیع و عریض کھلے اور پُر فضا مقام پر بہت خوب صورت اور شان دار تعمیرات کروا کے اچھے منصوبے اور نہایت اونچے عزائم کے ساتھ ایک معیاری اسکول کا آغاز کیا گیا، طلبہ آئے آتے گئے، نظام بھی بنتا گیا، بہت امیدیں بنیں، بڑی خوشی ہوئی مگر امیدوں کا یہ غُنچہ بِن کھلے ہی مُرجھا گیا، اس اسکول کے پیچھے جو جذبات تھے اور ان جذبات نے جس طرح جسم و جان کو گھلوا لیا تھا اُسے سوچ کر جب بھی مرحوم کی یاد آتی ہے پھوٹ پھوٹ کے رونے کو جی چاہتا ہے۔ مگر كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا نے ہر مشکل سہل کر دی۔ اس کی بابت مزید کچھ کہنا تو بے ضرورت اور بے محل ہے، البتہ اس نادر مثال نے بہت لوگوں کو کام کا حوصلہ دیا، صرف اس اسکول کے مشاہدے کے بعد فکر منداور باصلاحیت حضرات نے مختلف علاقوں میں اس نہج کے اسکول کھولے تا ہنوز کامیاب چل رہے ہیں، خود اس عاجز کے تلامذہ میں سے متعدد علماء کرام کامیاب مساعی کر رہے ہیں، حق تعالیٰ اِن مساعی جمیلہ کو مقاصد حسنہ کے نتیجے تک پہونچائے، آمین۔

اس خواہش کی حسبِ منشا اور حسبِ محنت حصول یابی میں ناکامی کے بعد میں نے یہ طئے کر لیا کہ اب جو کام بھی کیا جائے اپنے دائرۂ اسباب وقدرت کے اندر کیا جائے، چناں چہ ایک اور کام کی اللہ پاک نے اس کے معاً بعد توفیق عطا فرمائی جو تلافیِٔ مافات ثابت ہوا، وہ یہ کہ ریاست کے دیہی اور پس ماندہ علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کی اعتقادی و دینی صورت حال کا جائزہ لینے اور اصلاحی جد و جہد کرنے کی بعض تلامذہ کے تعاون اور فکروں سے توفیق ملی، تین منتخب علاقوں میں دیہی بچوں کے لئے مکاتبِ قرآنیہ کا قیام، وہاں کے باشندگان کی دینی تربیت کا نظام شروع کیا گیا، اس کے علاوہ خواہش مند بچوں کے لئے باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل کرنے کے لئے اقامتی سنٹرز کا قیام عمل میں لایا گیا، مخلص و محنتی حفاظ علماء کے ذریعہ الحمد للہ خوش آئند اور بہت حد تک قابلِ اطمینان کام ہوا اور اب بھی ہو رہا ہے، کئی حافظ بن چکے، کئی علماء بن رہے ہیں اور کئی طلبہ زیادتیِ عمر کی بنا انہی علاقوں میں مکاتب کے شیوع میں مدد کر رہے ہیں؛ الحمد للہ تعالیٰ ان مراکز کی نگرانی اور کام کرنے والوں کی راہنمائی کے بہانے سے چھوٹے چھوٹے قریوں اور نہایت خستہ حال مسلمانوں تک پہونچنے اُن کی معاشی و مذہبی پس ماندگی و بدحالی کو دیکھنے کا موقع ملا جس کے بارے میں یقین حاصل ہوا کہ شہروں میں بیٹھ کر اور شان دار

عمارتوں میں رہ کر ہم کبھی ان بے چاروں کے بارے میں نہ کچھ جان سکتے تھے اور نہ ہی کوئی خدمت بجالا سکتے تھے، یہ بھی اندازہ ہوا کہ تسلسُل کے ساتھ ملتے رہنے اور مختلف حوالوں سے رابطہ بنائے رکھنے کی برکت سے عرصے کے بعد کامیابی ملتی ہے، اس قدر گئے گذرے مسلمانوں کے قلوب بھی حمیتِ اسلامی اور غیرتِ ملی کی چنگاری لئے ہوئے ہیں جو علم سے دوری، اپنوں سے علاحدگی، اور معاشی تنگ دستی کے دبیز پرَتوں کے نیچے دبی ہوئی ہے اور وہ ادنیٰ محبت و یگانگت اور معمولی مدد و اعانت کے جھونکوں سے چمکنے دمکنے لگتی ہے، احساس ہوا کہ قوم غیروں سے زیادہ اپنوں کی بے اعتنائی و بے مروّتی کی مظلوم ہے؛ بہرحال اس کام کے تجربے نے کام کرنے کی جرأت اور فکر پیدا کی۔ فالحمد للہ علی ذالك

(بقیہ آئندہ)

(بقیہ صفحہ ۱۳ سے)

دیکھئے ان واقعات میں کتنا سبق اور کس درجہ عبرت موجود ہے کہ صحابہ کرامؓ خود آپس میں ایک دوسرے سے علم حاصل کرنے کے واسطے بلکہ صرف ایک حدیث کی سند کو متصل اور عالی بنانے کے واسطے کتنے لمبے سفر اور کیسی مشقتیں اُٹھاتے تھے، اور کیسی تمنائیں اور دعائیں کرتے تھے، اِن واقعات سے علم دین کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہم کم ہمتوں کو بھی ان واقعات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ پھر یہ ایک واقعہ ہی نہیں ہے صحابہ کرامؓ سے ایسے اور بھی واقعات منقول ہیں جو خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ''الرحلة فی طلب الحدیث'' میں تخریج کئے ہیں، یہ بہت نافع کتاب ہے، طالب علموں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

حضرت تمیمہ رضی اللہ عنہا

نام ونسب: تمیمہ نام، والد کا نام وہب، بنوقریظہ سے نسبی تعلق تھا۔(اسد الغابۃ:۱۸۱/۲)

نکاح وطلاق:

نکاح حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، مگر نباہ نہ ہوسکا، اس لئے حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ نے طلاق دے دی، اس کے بعد حضرت عبدالرحمن بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا، لیکن بعض وجوہ کی بناء پر عبدالرحمٰن بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی علاحدگی اختیار کرنا چاہی اور دوبارہ پہلے شوہر کے پاس جانا چاہی۔ مگر پہلے شوہر کے پاس لوٹنے کے لئے شوہر ثانی سے مباشرت ضروری تھی، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کرنے لگیں کہ علاحدگی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے؛ مگر اجازت نہیں ملی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد سعادت تک عبدالرحمن بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہیں۔

اس کی تفصیل بخاری کی روایت کے مطابق اس طرح ہے کہ:

ایک دفعہ رفاعہ قرظی کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے عرض کیا کہ میرے شوہر رفاعہ نے مجھے تین طلاقیں دیں تو میں نے عدت گذارنے کے بعد عبدالرحمٰن بن زبیرؓ سے نکاح کرلیا، مگر میں نے ان کو نامرد اور عورتوں کے حق میں ناکارہ پایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ کیا تم رفاعہ کے پاس لوٹنا چاہتی ہو، انہوں نے کہا: ہاں! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ: تم رفاعہ کے پاس اس وقت تک نہیں جاسکتی جب تک کہ تم عبدالرحمن کا تھوڑا سا مزہ نہ چکھ لو اور وہ تمہارا ذائقہ نہ چکھ لیں، یعنی جماع کی لذت اور حلاوت حاصل نہ کرلو' (بخاری: باب من قال لامرأتہ: أنت علی حرام، حدیث: ۸۲۶۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد سعادت تک عبدالرحمٰن بن زبیرؓ کے ساتھ رہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے

---

* رفیق تصنیف دارالدعوۃ والارشاد، حیدرآباد، واستاذ حدیث دارالعلوم دیودرگ

عہد خلافت میں انہوں نے پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنے شوہر ثانی سے علاحدگی کی اجازت چاہی، لیکن آپ نے اجازت نہیں دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ان سے بھی اجازت چاہی، حضرت عمرؓ نے بڑی سختی سے فرمایا کہ اگر اب آؤ گی تو رجم کردوں گا۔(اسد الغابۃ)

آپ کی زندگی کا یہی واقعہ تمام ارباب رجال لکھتے ہیں، اس کے علاوہ اور حالات نہیں مل سکے۔

وفات: وفات کی تصریح نہیں ملی، لیکن اوپر کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد فاروقی تک باحیات رہیں۔

حضرت خالدہ رضی اللہ عنہا

نام ونسب: خالد یا خلدہ، والد کا نام حارث، حضرت عبداللہ بن سلام کی چچی ہوتی تھیں۔

اسلام: حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے منتظر تھے کہ ایک شخص نے آپ کی آمد کا مژدہ سنایا، میں بے تابی سے اٹھا، میری چچی خالدہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، میری بیتابی دیکھ کر انہوں نے کہا موسیٰ بن عمران (علیہ السلام) کا اگر ظہور ہوتا تو کیا تمہیں اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم یہ تو نبوت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی ہیں، دونوں کی بعثت کا مقصد ایک ہے، اس پر ان کی چچی نے تعجب سے کہا کہ کیا یہ وہی نبی تو نہیں ہیں جن کی بعثت کے ہم سب منتظر تھے؟ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے انہیں اثبات میں جواب دیا، اور وہاں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اسلام کی دولت سے بہرہ اندوز ہوئے اور پھر گھر آکر گھر کے سارے افراد کو جن میں حضرت خالدہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں، اس سے بہرہ اندوز کیا۔ زندگی کے دوسرے کارنامے اور وفات وغیرہ کے متعلق کوئی تصریح نہیں ملتی۔

(بقیہ صفحہ ۲۰ سے)

دیگر شہداء کرام کی نیاز کا شربت بنانا، پانی اور شربتوں کی سبیل لگانا۔ وغیرہ وہ پھیلتے ناسور ہیں جن کو ختم کرنا مسلم معاشرہ اور بالخصوص دانشوران قوم وملت کی ذمہ داری ہے، صحابہؓ وصحابیاتؓ کی سیرت کو اور تمام ماہ وسال سے جڑے واقعات کو تاریخی حقائق کی روشنی میں امت مسلمہ کے سامنے میں پیش کیا جائے تو یقیناً معاشرہ تمام رذائل سے پاک اور فضائل وخصائل سے ہم کنار ہوگا۔

خدا تعالیٰ ہمیں بدعات وخرافات سے بچائے، اپنی نعمتوں کی قدردانی کا جذبہ پیدا فرمائے۔ آمین

اصلاحی مضامین

یوم عاشوراء اور مسلم معاشرہ

مولانا محمد معراج صاحب حسامی*

اسلام دینِ فطرت اور تعلیماتِ خداوندی کا حسین مظہر ہے، اس نے تمام انسانوں کو انسانیت وشرافت کا پیغام دیا، ہدایت وراستی کی راہ بتائی، بدعات وخرافات سے پاک رکھا اور امن وسلامتی کا درس دیا؛ اس لئے ہر انسان کی کامیابی اسی میں ہے کہ دینِ اسلام کو اپنائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرے، اس کے ساتھ ساتھ باری تعالیٰ کے اس کارخانہ عالم میں عبرت انگیز ونصیحت آمیز واقعات کا تسلسل ہے اور زمانہ کی نگاہیں روئے زمین پر ایسے اَن گنت حوادث کی شاہد ہیں جو اقوامِ عالم کے لئے نشانِ عبرت ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی سنِ ہجری کا پہلا مہینہ محرم الحرام اپنی خصوصیت اور تاریخی حیثیت کی بنا پر دیگر مہینوں سے ممتاز ہے، ماہ محرم جہاں ایک طرف اسلامی تقویم کی اولین کڑی ہے وہیں عظمت وفضیلت اور حرمت وتقدس کے باب میں روزِ اول سے نمایاں مقام کا حامل ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ (سورۃ التوبہ:۳۶)

چار حرمت والے مہینوں میں سے یہ ایک مہینہ بھی قابل حرمت ہے اس مہینہ کا خوب احترام واکرام کیا جائے، قتل وغارت، لوٹ، مار کے سب دروازے بند کردئے جائیں، تہذیب وتمدن کی بقاء اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے نسل انسانی کے وقار اور اس کے تحفظ کے بندھنوں کو باقی رکھا جائے۔

۱۰ ؍محرم کو اور دنوں کے مقابلے میں کیا خصوصیت حاصل ہے اور یہ عاشوراء کے نام سے کیوں معروف ہے؟ اس سلسلے میں محققین کا بیان ہے کہ اس تاریخ میں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے جن کے بغیر اسلامی تاریخ نامکمل ہے، اس طرح کئی دس تاریخوں کے یکجا ہونے کی بناء پر اس کا نام یوم عاشوراء رکھا گیا ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلوی قدس سرہٗ شمائل ترمذی کی مشہور ومقبول شرح خصائل نبوی میں یوں رقم طراز ہیں:

(۱) یومِ عاشوراء کو حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی۔(۲) اسی دن حضرت نوح علیہ السلام کی

*استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ ہذا

کشتی جودی پہاڑ کے کنارے پر ٹھہری تھی ۔(۳) اسی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات ملی تھی، اسی دن فرعون غرق بھی ہوا تھا۔(۴) اسی دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی تھی، اسی دن وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے ۔(۵) اسی دن حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے بطن سے نجات ملی، اور اسی دن ان کی امت کا قصور معاف ہوا۔(۶) اسی حضرت یوسف علیہ السلام کنعان کے کنویں سے نکالے گئے ۔ (۷) حضرت یعقوب علیہ السلام کو مشہور مرض (نابینائی) سے صحت ہوئی ۔(۸) اسی دن حضرت ادریس علیہ السلام آسمان پر اٹھالئے گئے ۔(۹) اسی دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی ۔(۱۰) اسی دن حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملک وبادشاہی کا تاج عطا ہوا۔(صفحہ:۲۵۸) ان کے علاوہ مؤرخین ومحققین نے یوم عاشوراء سے مربوط کئی اہم واقعات کو اپنی تصانیف میں جگہ دی۔

یوم عاشوراء کے متعلق رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں دو چیزیں ملتی ہیں ۔۱) روزہ کا اہتمام ۔۲) اہل وعیال پر رزق میں فراخی وکشادگی۔

فضیلت صوم یوم عاشورہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی فضیلت والے دن کے روزہ کا اہتمام بہت زیادہ کرتے نہیں دیکھا، سوائے اس دن یعنی یوم عاشوراء کے اور سوائے اس ماہ یعنی رمضان المبارک کے۔

(بخاری:۱/۲۳۸، مسلم:۱/۳۲۱)

ایک اور روایت میں یوم عاشوراء کے روزہ کے اہتمام پر بندہ کے گذشتہ سال کے سیئات مٹادینے کی خوشخبری سنائی گئی، حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھے امید ہے کہ عاشوراء کے دن کا روزہ گذشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا۔(مسلم:۱/۳۲۸، ابن ماجہ:۱/۲۵)

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کفار ومشرکین کی مشابہت اور یہود ونصاریٰ کی طرزِ روش اختیار کرنے سے منع کیا گیا کہ یوم عاشوراء کے ساتھ ایک دن کا روزہ اور ملالو، بہتر تو یہ ہے کہ نویں اور دسویں تاریخ کا روزہ رکھو، اور اگر کسی وجہ سے نویں کا روزہ نہ رکھ سکو تو پھر دسویں کے ساتھ گیارھویں کا روزہ رکھو تاکہ یہود کی مخالفت ہوجائے، اور ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی مشابہت باقی نہ رہے۔ جیساکہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوم عاشوراء کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہود ونصاریٰ اس دن کو بڑے دن کی حیثیت سے مناتے ہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فاذا کان العام المقبل ان شاء اللہ صمنا الیوم التاسع قال فلم یأت العام المقبل حتی توفی

رسول اللہ ﷺ یعنی جب اگلا سال آئے گا تو ہم نویں کو بھی روزہ رکھیں گے انشاء اللہ۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اگلا سال آنے سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ (مسلم: ۱/ ۳۵۹)

اہل وعیال پر رزق میں فراخی

یوم عاشوراء میں دوسری چیز جو ثابت ہے وہ اہل وعیال پر رزق میں فراخی ہے، اس عمل کی برکت سے تمام سال رزق میں فراخی کا اعلان کیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال پر کھانے پینے کے سلسلے میں فراخی اور وسعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ پورے سال اس کے رزق میں وسعت عطا فرمائیں گے۔ (الترغیب والترھیب: ۲/ ۱۱۵)

اِن نبوی ارشادات سے پتہ چلا کہ یوم عاشوراء امتِ مسلمہ کے لئے دنیا وآخرت میں خیر اور بھلائی کا باعث ہے، جس میں روزہ رکھنے پر آخرت میں بخشش اور اہل وعیال پر وسعت وفراخی پر دنیا میں کشائش رزق کا ثمرہ حاصل ہوتا ہے۔

مگر افسوس کہ ہمارا مسلم معاشرہ بے شمار غلط کاریوں میں ڈوبا ہوا ہے، ماہِ محرم کے تعلق سے غلط تصور لیا ہوا ہے، طرح طرح کی خرافات، رسومات اور بدعات ایجاد کر کے اس کے تقدس کو اس طرح پامال کر رہا ہے کہ الامان والحفیظ! چند در چند خرافات کے نتیجے میں گناہوں کا ایک نیا باب کھل چکا، شاعر مشرق علامہ اقبال نے مسلم معاشرہ میں پائی جانے والی اِنہی خرافات ورسومات پر یوں افسوس کا اظہار کیا ہے ؎

مسلمان ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتان عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھوگئی

کچھ لوگ ماہِ محرم کا چاند نظر آتے ہی سیاہ جھنڈے بلند کرتے ہیں، سیاہ کپڑے زیب تن کرنے کو اہلِ بیت سے محبت کا جھوٹا عنوان دیتے ہیں، تعزیہ وتابوت بناتے ہیں، نوحہ وماتم کرتے ہیں، عورتیں اپنے بدن سے زیوارت نکالتی ہیں، ماتمی جلوس، شور شرابا، ڈھول تاشے، ناچ گانے، اور حسینؓ کی سواری کا آنا وغیرہ ایسی خرافات ہیں کہ ایک عام آدمی تو درکنار ایک جاہل ونادان شخص بھی ایسی جہالت دیکھ کر آنسو بہانے پر مجبور ہوگا، یہی نہیں کہ بلکہ عظیم المرتبت صحابہ واسلاف کو نعوذ باللہ سب وشتم کرنا، طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا، غم اور سوگ منانا، زنجیروں اور چھریوں سے سینہ کوبی کرنا، نواسۂ رسول حضرت سیدنا حسینؓ اور۔۔۔۔۔ (بقیہ صفحہ ۱۷ پر)

اصلاحی مضامین

محرم الحرام میں شادی بیاہ کا حکم

از: مفتی محمد راشد ڈسکوی*

اسلامی سال کے پہلے مہینے محرم الحرام کو سال کے بارہ مہینوں میں خاص طرح کا امتیاز حاصل ہے، صحیح البخاری میں ایک حدیث مبارکہ ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک طویل اور نہایت ہی قیمتی نصائح پر مشتمل خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں یہ بات بھی تھی کہ ”(اس وقت) زمانہ اسی رفتار اور ہیئت پر آچکا ہے، جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا فرمایا تھا، ایک سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، جن میں سے تین مہینے یعنی: ذوالقعدہ ذوالحجہ اور محرم الحرام تو مسلسل ہیں اور ایک ”رجب“ کا مہینہ ہے، جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان آتا ہے۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 4294)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف فرامین کے مطابق اس ماہ مبارک میں کیے جانے والے اعمال کا اجر بنسبت دیگر ایام یا مہینوں کے زیادہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مہینے میں روزے رکھنے کے بارے میں ارشاد فرمایا: ”رمضان المبارک کے بعد افضل ترین روزے اللہ تعالیٰ کے یہاں محرم الحرام کے روزے ہیں“۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1163)

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس مہینے میں فضیلت محض روزے رکھنے کی ہی نہیں ہے، بلکہ ہر نیک عمل بہت بڑھا ہوا ہے، چناں چہ اعمال میں سے ایک بڑا اور اہم عمل نکاح کا بھی ہے، معاشرے میں ماہِ محرم الحرام سے متعلق کچھ ایسا تصور اور رجحان عام ہو چکا ہے کہ اس مہینے میں نہ نکاح کرنا ہے اور نہ ہی شادی، حالاں کہ شریعت کا مزاج اور احکامات اس کی صریح نفی کرتے ہیں۔

”عمل نکاح“ چاہے کسی مہینے میں ہو، یہ اپنی اصل کے اعتبار سے مباح ہے اور مباح کام کا ناجائز ہونا کسی واضح ممانعت سے ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس مہینے میں، یا اس کے علاوہ کسی اور مہینے میں شریعت کی طرف کسی قسم کی کوئی ممانعت نہیں ملتی، نہ کتاب وسنت میں، نہ اجماع امت سے اور نہ ہی قیاس وغیرہ سے۔ چناں چہ جب ایسا ہے تو نکاح اپنی اصل (مباح ہونے) کے اعتبار سے جائز ہی رہے گا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے

* استاد ورفیق شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ فاروقیہ کراچی

کہ فقہائے کرام کا اس بات پر (کہ محرم یا اس کے علاوہ کسی بھی مہینے میں نکاح کرنا ناجائز نہیں ہے۔) کم از کم اجماعِ سکوتی ہے۔ کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین و تبع تابعین اور متقدمین یا متاخرین فقہاء میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اس ماہ مبارک میں شادی، بیاہ وغیرہ کو ناجائز قرار دیتا ہو۔ لہٰذا اگر کوئی اس کو منع بھی کرتا ہوگا تو اس کا منع کرنا بغیر دلیل کے ہوگا اور کسی بھی درجہ قابل اعتبار نہیں ہوگا۔

اس ماہ میں نکاح سے منع کرنے کی بنیاد کیا ہے؟ چناں چہ تتبع سے عقلاً اس کی بنیاد اس مہینے کا منحوس ہونا ہوسکتی ہے، یا غم والا مہینہ ہونا (جس کی بنا پر سوگ کو لازم سمجھا جاتا ہے اور سوگ والے دنوں یا مہینوں میں شادی کو ناجائز سمجھا جاتا ہے)۔ ذیل میں ہر دو امر کا جائز لیا جاتا ہے۔

کیا ماہ محرم نحوست والا مہینہ ہے؟

مزاج شریعت سے معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی اس مہینے کی نحوست کا قائل نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلوات سے بہت پہلے سے ہی اس مہینے کا معزز و مکرم اور ذی شرف ہونا مشہور و معروف چلا آرہا ہے، حتی کہ زمانے کی ابتدا سے اب تک ہر ذی شان کام کا اسی مہینے میں وقوع پذیر ہونا زبان زد عام ہے۔ بلکہ روایات کے مطابق تو وقوع قیامت کا عظیم الشان واقعہ بھی اس مہینے میں ہوگا۔

چناں چہ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے اس مہینہ کو نحوست والا قرار دینا ممکن ہی نہیں، لہٰذا اس بنا پر تو اس مہینے میں نکاح سے روکنا عقلاً صحیح ممکن نہیں ہے۔

کیا ماہ محرم غم والا مہینہ ہے؟

اس مہینے میں شادی سے روکنے والے اگر اس بنیاد پر شادی سے روکتے ہیں کہ یہ غم اور سوگ کا مہینہ ہے، لہٰذا اس مہینے میں خوشی نہیں منانی چاہیے، کیوں؟! اس لیے کہ اس مہینے میں نواسۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے چھوٹوں اور بڑوں کو ظالمانہ طور پر نہایت بے دردی سے شہید کر دیا گیا، ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لیے غم منانا، سوگ کرنا اور ہر خوشی والے کام سے گریز کرنا ضروری ہے، تو یہ انتہا درجے کی جہالت اور احکامات دینیہ سے ناواقفیت کی علامت ہے، اس لیے کہ "شہادت" جیسی نعمتِ بے بہا کسی بھی طور پر غم کی چیز نہیں ہے، یہ تو سعادت اور فخر کی چیز ہے۔ یہاں سوچنا تو یہ ہے کہ ہمیں اس بارے میں شریعت کی طرف سے کیا راہ نمائی ملتی ہے؟؟!! تعلیماتِ نبویہ علی صاحبہا الف تحیہ سے تو یہ سبق ملتا ہے کہ شہادت کا حصول تو بے انتہا سعادت کی بات ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شوق شہادت

شہادت تو ایسی عظیم سعادت اور دولت ہے، جس کی تمنا خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لیے کی اور امت کو بھی اس کی ترغیب دی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں، پھر شہید کر دیا جاؤں، (پھر مجھے زندہ کر دیا جائے) پھر میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں اور شہید کر دیا جاؤں، (پھر مجھے زندہ کر دیا جائے) پھر میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں اور پھر شہید کر دیا جاؤں“۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب: فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللہ، رقم الحدیث: 4967)

صحابہ کرامؓ کا شوقِ شہادت

یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مستقل حصولِ شہادت کی دعا مانگا کرتے تھے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل المدینہ) حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنہیں بارگاہِ رسالت سے سیف اللہ کا خطاب ملا تھا، وہ ساری زندگی شہادت کے حصول کی تڑپ لیے ہوئے قتال فی سبیل اللہ میں مصروف رہے، لیکن اللہ کی شان کہ انہیں شہادت نہ مل سکی، چناں چہ جب ان کی وفات کا وقت آیا تو پھوٹ پھوٹ کے رو پڑے کہ میں آج بستر پر پڑا ہوا اونٹ کے مرنے کی طرح اپنی موت کا منتظر ہوں۔

(البدایہ والنھایہ، سنۃ احدی وعشرین، ذکر من توفی احدی وعشرین: 7/114، مکتبۃ المعارف، بیروت)

الغرض یہاں تو صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ شہادت تو ایسی نعمت ہے کہ جس کے حصول کی شدت سے تمنا کی جاتی تھی، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر افسوس اور غم منایا جائے، اگر اس عمل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر غور کر لیا جائے کہ پورے سال کا ایسا کون سا مہینہ یا دن ہے جس میں کسی نہ کسی صحابیٔ رسول کی شہادت نہ ہوئی ہو، کتب تاریخ اور سیر کو دیکھ لیا جائے، ہر ماہ کسی نہ کسی کی شہادت مل جائے گی، مثلاً:

● صفر: 3ھ میں مقام رجیع میں 8/صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شہید کیا گیا۔ ● صفر: 4ھ میں بئر معونہ کے واقعے میں کئی اصحاب صفہ کو شہید کیا گیا۔ ● صفر: 52ھ میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔

● ربیع الاول: 18ھ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ ● ربیع الاول: 20ھ میں ام المؤمنین حضرت زینب بن جحش رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔

● ربیع الثانی: 21ھ میں مقام نہاوند میں ایرانی کفار سے لڑائی کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو لاکھ ایرانیوں کے مقابلے کے لیے چالیس ہزار مسلمانوں کی فوج بھیجی جس میں تقریباً تین ہزار مسلمان شہید ہوئے اور کفار کے تقریباً ایک لاکھ افراد واصل جہنم ہوئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ ● ربیع الثانی: 21ھ میں مشہور صحابی

رسول حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔● ربیع الثانی: 50ھ میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔

● جمادی الاولیٰ: 8ھ میں حضرت سراقہ بن عمروؓ کی شہادت ہوئی۔● اسی سال، اسی مہینے حضرت عبادہ بن قیس رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی۔● جمادی الاولیٰ: 8ھ میں ہی غزوہ موتہ ہوا، جس میں کئی جلیل القدر اصحاب رسول رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔

● جمادی الاخریٰ: 4ھ میں حضرت ابوسلمہ عبد اللہ بن عبد الاسد رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔● جمادی الاخریٰ: 13ھ میں صحابیِ رسول حضرت ابوکبشہؓ کی وفات ہوئی۔● جمادی الاخریٰ: 21ھ میں حضرت خالد بن ولید کی وفات ہوئی۔● جمادی الاخریٰ: 50ھ میں حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کی وفات ہوئی۔

● رجب المرجب: 15ھ میں حضرت سعد بن عبادہؓ کی وفات ہوئی۔● رجب المرجب: 20ھ میں حضرت اُسید بن حضیرؓ کی وفات ہوئی۔● رجب المرجب: 45ھ میں حضرت زید بن ثابتؓ کی وفات ہوئی۔

● شعبان: 9ھ میں بنتِ رسول حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔● شعبان: 50ھ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔● شعبان: 93ھ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔

● رمضان: 10 نبوی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی۔● رمضان: 2ھ میں بنت رسول حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی۔● رمضان: 11ھ میں بنت رسول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔● رمضان: 32ھ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔

● شوال: 3ھ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی۔● شوال: 38ھ میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔

● ذوالقعدہ: 62ھ میں مشہور تابعی حضرت مسلمہ بن مخلدؒ کا انتقال ہوا۔● ذوالقعدہ: 106ھ میں حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب کا انتقال ہوا۔

● ذوالحجہ: 5ھ میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔● ذوالحجہ: 6ھ میں حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔● ذوالحجہ: 12ھ میں حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔

اس پوری تاریخ کا مقتضا تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر دن کو اظہارِ غم اور افسوس بنایا جائے۔ اور شادی وغیرہ ہر خوشی اور اظہار خوشی سے گریز کیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بھی ذی شعور اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

نیز! اس بات کو بھی دیکھا جائے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی تو کئی عظیم اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کی محبوب شخصیات کو شہادت ملی، لیکن کیا ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کی شہادت کے دن کو بطور یادگار کے منایا؟؟!! نہیں؛ بالکل نہیں، تو پھر کیا ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ غم محسوس کرنے والے ہیں؟ خدارا! ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور اس قسم کی شیطانی اور گم راہ کن رسومات سے بچنے کی مکمل کوشش کریں۔

شرعاً سوگ کرنے کا حکم

شرعاً سوگ کرنے کی اجازت صرف چند صورتوں میں ہے اور وہ بھی صرف عورتوں کے لیے، نہ کہ مردوں کے لیے: 1) ایسی عورت جس کو طلاق بائن دی گئی ہو، اس کے لیے صرف زمانہ عدت میں۔

2) جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے، اس کے لیے صرف زمانہ عدت میں۔

3) کسی قریبی رشتے دار کی وفات پر صرف تین دن کے لیے۔ اس کے علاوہ کسی بھی موقعہ پر عورت کے لیے سوگ کرنا جائز نہیں ہے۔

اور سوگ کا مطلب یا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس عرصہ میں زیب وزینت اور بناؤ سنگھار نہ کرے، زینت کی کسی بھی صورت کو اختیار نہ کرے، مثلاً: خوش بو لگانا، سرمہ لگانا، مہندی لگانا اور رنگ برنگے خوش نما کپڑے وغیرہ پہننا، اس کے علاوہ کوئی صورت اپنانا، مثلاً: اظہارِ غم کے لیے بلند آواز سے آہ وبکا اور سیاہ لباس پہننا وغیرہ جائز نہیں۔ نیز! مردوں کے لیے تو کسی صورت میں سوگ کی اجازت نہیں ہے تو پھر محرم الحرام کے شروع ہوتے ہی سوگ اور ماتم کے نام پر پورے ملک وملت کو عملی طور پر یرغمال بنا لینا کیا معنی رکھتا ہے؟؟!!

محرم الحرام میں شادی کرنے کا حکم

اوپر ذکر کی گئی تفصیل کے مطابق اس ماہِ مبارک میں سوگ کرنا بالکلیہ بے اصل اور دین کے نام پر دین میں زیادتی ہے، جس کا ترک لازم ہے، لہٰذا جب سوگ جائز نہیں ہے تو پھر شرعاً اس مہینے میں شادی نہ کرنے کی وجہ یہ بھی نہیں بن سکتی۔

بنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی:

بلکہ عجیب بات تو یہ ہے کہ ایک معتبر قول کے مطابق امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے نکاح اسی ماہِ مبارک میں ہوا، اگرچہ اس قول کے علاوہ دیگر اقوال بھی ملتے ہیں۔
(ملاحظہ ہو: تاریخ مدینۃ الدمشق لابن عساکر، باب ذکر بنیہ وبناتہ علیہ الصلاۃ والسلام وأزواجہ: 3/ 128، دار الفکر)

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر طرح کے منکرات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور افراط وتفریط سے بچتے ہوئے صراط مستقیم پر گام زن رکھے۔ آمین

اصلاحی مضامین

تحریر: شیخ عبدالفتاح ابوغدہ
تلخیص وترجمہ: حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہٗ

بالخصوص طلبۂ علم دین کے لئے

صحابۂ کرامؓ اور راہِ علم کے مجاہدات

صحابہ کرامؓ دین کے روشن ستارے اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد ہمارے مقتدا ہیں، سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اگر کسی کو اپنا پیشوا بنانا ہے تو وہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد) صحابہ کرامؓ کو اپنا پیشوا بنائے، اس لئے کہ یہ حضرات اس اُمت کے سب سے پاک دل، عمیق العلم، بے تکلّف، مضبوط دین والے اور عمدہ اخلاق والے لوگ ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور ساتھی بنانے اور اپنے دین کے قائم کرنے کے لئے منتخب فرمایا ہے، پس تم اُن کے مرتبے کو سمجھو، اُن کے نشانِ راہ کا اتباع کرو، اور جس قدر ممکن ہو ان کے اخلاق وعادات کو مضبوطی سے تھام لو، کیوں کہ یہی لوگ سیدھے راستے پر قائم ہیں۔

امام ابن حزمؒ نے بہت جامع اور مختصر انداز میں صحابہ کرام کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: صحابی اُس شخص کو کہتے ہیں جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اختیار کی ہو، خواہ ایک لمحے کے لئے ہی سہی، اور اُن سے دین کی باتیں سُنی ہوں خواہ ایک کلمہ ہی کیوں نہ ہو، یا ان کے کسی عمل کا مشاہدہ کر کے محفوظ رکھا ہو اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جو نفاق میں مبتلا ہوئے اور اُن کا منافق ہونا معروف ہوگیا تھا، صحابہؓ سب کے سب عادل فاضل اور پسندیدہ لوگ ہیں، ان کی عظمت وفضیلت کا اعتراف واحترام ہم پر لازم ہے، ان کی لغزشوں کے لئے استغفار کرتے رہنا اور اُن سے محبت رکھنا ہماری ذمہ داری ہے، کیوں کہ ان کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی مجلس میں شریک ہونا ہماری عمر بھر کی عبادتوں سے بہتر ہے، اور اُن کا ایک کھجور صدقہ کرنا ہماری تمام تر دولت کے صرف کر دینے سے بہتر ہے، جیسا کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میرے اصحاب کا معاملہ میرے لئے رہنے دو اس لئے کہ تم میں سے کسی شخص کا اُحد پہاڑ کے برابر سونا خیرات کرنا اُن کے ایک مُد بلکہ آدھے مُد جَو خیرات کرنے کے برابر بھی نہیں ہوسکتا'' اس بُونِ بعید کے بعد آپ ہی سوچیے کون عقل مند ان کی برابری کا مدعی ہوسکتا ہے؟

تقی الدین سُبکیؒ فرماتے ہیں: صفاتِ حسنہ ذوات وصُور سے کہیں زیادہ محبوب ہوا کرتے ہیں، ہم حضرات خلفائے راشدین کو ان کی ذات وشخصیات سے زیادہ اُن کے عالی صفات اور بلند مدارج کی وجہ سے محبوب رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ ہمارے لئے انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ قابلِ احترام اور لائقِ اقتداء ہیں، اس لئے حصولِ علم کے راستے میں مشقتیں جھیلنے اور مجاہدے کرنے کے معاملے میں بھی اُن کے ھدی وطریق سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ چناں چہ چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

● اس سلسلے میں بڑی عمدہ مثال سیدنا ابوذر غفاریؓ کی ہے، جب اُنہیں نبی کریم ﷺ کی بعثت ودعوت کے بارے میں علم ہوا تو انہوں نے پہلے اپنے بھائی اُنیس غفاری کو مکہ مکرمہ روانہ کیا، تاکہ وہ حقیقتِ واقعہ معلوم کرکے لائیں، اور براہِ راست نبی کریم ﷺ کی باتیں سُن کے آئیں، چناں چہ وہ سفر کرکے مکہ مکرمہ پہونچے، نبی کریم ﷺ سے ملاقات کی، آپ کی باتیں سُنیں، واپس آکر اطلاع دی کہ وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، نیز ایسا کلام سناتے ہیں جسے شعر شاعری نہیں کہا جاسکتا، سیدنا ابوذر غفاریؓ نے یہ سُن کر فرمایا، ابھی اس سلسلے مجھے تشفی نہ ہوسکی، اور اطمینانِ قلب حاصل نہ ہوسکا، اس لئے میں خود جاکے اطمینان کرتا ہوں، پھر فوراً ہی سامانِ سفر تیار کرکے مکہ مکرمہ کی طرف چل پڑے۔

آگے کیا ہوا؟ اس سلسلے میں دو روایات ہیں ایک بخاری ومسلم میں مروی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ والی، دوسری مسلم میں مروی عبداللہ بن صامتؓ والی ـــــ جو اُن کے بھتیجے ہیں ـــــ دونوں واقعات سبق آموز ہیں:

۱ء جب وہ مکہ مکرمہ پہونچ گئے تو مسجد حرام میں داخل ہوئے اور آپ ﷺ کی تلاش شروع کردی، چوں کہ وہ پہلے سے آپ کو پہچانتے نہیں تھے اور مقامی لوگوں سے دریافت کرنا بھی خلافِ مصلحت سمجھتے تھے، اس لئے کسی سے کچھ کہا نہیں یہاں تک کہ رات ہوگئی، رات وہیں حرم شریف میں لیٹ گئے، سیدنا علیؓ کا اُن کے پاس سے گذر ہوا تو اجنبی مسافر ہونے کی وجہ سے اُنہیں اپنے گھر لے گئے، کھانا کھلایا، آرام کرایا، مگر دونوں نے بھی ایک دوسرے سے کچھ پوچھا نہیں، اگلا دن گذرا اور رات کو وہ پھر کہیں لیٹ گئے تو حضرت علیؓ ہی نے دیکھ کر آج بھی اپنا مہمان بنالیا؛ تیسرے دن پھر یہی معاملہ ہوا تو حضرت علیؓ نے دریافت کیا آپ ابھی تک وطن نہیں لوٹے؟ کیا آپ کا کام نہیں بنا؟ کیسے آنا ہوا تھا؟ انہوں نے کہا کہ اگر آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ میری صحیح راہنمائی کریں گے اور خیر خواہی سے کام لیں گے تو میں اپنے آنے کی غرض بتاؤں گا ورنہ نہیں، حضرت علیؓ نے وعدہ فرمایا؛ اب انہوں نے اپنے سفر اور مکہ مکرمہ حاضری کی غرض بتلادی، حضرت علیؓ نے فرمایا ہاں! جو خبر آپ کو

پہونچی ہے وہ برحق ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، صبح کو آپ میرے ساتھ چلیں مگر راستے میں اجنبی کی طرح انجان رہیں، اگر میں کوئی خطرہ محسوس کروں گا تو پیشاب کرنے کے بہانے ایک طرف کو ہوجاؤں گا تو آپ چلتے رہنا، پھر میرے ساتھ ہوجانا، چناں چہ صبح کو دونوں چلے اور بہ خیر وخوبی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہونچ گئے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے براہِ راست آپ کی باتیں سُنیں تو بہت متأثر ہوئے اور اسی وقت مسلمان ہوگئے۔

۲ء ہمارے قبیلے کے لوگ حج کی تیاری میں تھے، میں میرا بھائی اور والدہ علاحدہ سفر کررہے تھے، جب ہم مکہ مکرمہ کے قریب پہونچے تو میرے بھائی اُنیس نے کہا مجھے مکہ میں کچھ کام ہے، ہوکے آتا ہوں آپ لوگ یہیں رہیں، چناں چہ وہ گئے مگر آنے میں بہت تاخیر کردی، انتظار اور تشویش ہونے لگی، پھر جب وہ واپس ہوئے تو تاخیر کی وجہ بتلاتے ہوئے سنایا کہ مکے میں ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوگئی تھی جو رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، میں نے پوچھا کہ مقامی لوگوں کا ان کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ انہوں نے بتلایا کہ لوگ تو اُنہیں شاعر، کاہن، ساحر وغیرہ کہتے ہیں، مگر میں نے کاہنوں کی باتیں بہت سنی ہیں اُن کی باتیں کاہنوں والی نہیں ہیں اور جہاں تک شعر شاعری کا معاملہ تو میں خود بڑا شاعر ہوں، میں نے اِن کی باتیں نام وَر شاعروں کے کلام سے جوڑ کر دیکھیں تو شعر شاعری کے قواعد پر بھی نہیں اُترتیں، میرا ضمیر کہتا ہے کہ بہ خدا وہ اپنے دعوے میں بالکل سچے ہیں، ان کی قوم کے لوگ ہی جھوٹے ہیں۔

یہ سُن کر میں نے اُن سے کہا، اچھا اب تم یہیں رہو میں جا کر خود تحقیق کرتا ہوں، چناں چہ میں حرم شریف پہونچ گیا، وہاں ایک ضعیف وکم زور آدمی نظر آیا تو ــــ یہ سمجھ کر کہ کم زور لوگوں سے کسی تشدُّد کا خطرہ نہیں ہوتا، اس لئے اسی بوڑھے سے معلوم کرنا چاہیے، ــــ میں نے اس سے پوچھا کہ: وہ صاحب کہاں رہتے ہیں جنہیں آپ لوگ صابئ کہتے ہیں؟ اُس نے میرے طرف اشارہ کرکے لوگوں کو آواز دی کہ دیکھو یہ رہا صابئ! یہ سُنتے ہی لوگوں کا ایک ہجوم مجھ پر ٹوٹ پڑا اور ڈھیلوں اور ہڈیوں کی بارش ہونے لگی یہاں تک کہ میں غش کھا کے گر پڑا، پھر جب افاقہ ہوا تو اپنے آپ کو دیکھا کہ میں زخموں کے خون سے قربان گاہ کے پتھر کی طرح سُرخ ہوگیا تھا؛ پھر میں زم زم کے کنویں پر آیا اور اپنے جسم کو دھو کر خون صاف کیا، میں مکے میں کوئی ایک ماہ تک مقیم رہا، میرے پاس بہ جز زم زم کے نہ کوئی کھانے کی چیز تھی نہ پینے کی، زم زم ہی پیتا رہا اسی سے بھوک اور پیاس دونوں مٹاتا رہا، یہ زم زم کی برکت تھی کہ اُس نے مجھے نہ صرف یہ کہ کھانے پینے سے بے نیاز کردیا بلکہ میں اسی پانی کی وجہ سے فربہ اور دوہرا ہوگیا۔

ایک چاندنی رات میں اہلِ مکہ پر نیند طاری تھی، گویا سارا مکہ سو رہا تھا اور مطاف میں کوئی موجود نہ تھا، میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں مل کر تشریف لائے، حجرِ اسود کا استلام کیا، پھر دونوں نے ساتھ ساتھ طواف کیا اور نماز ادا کی، جب یہ لوگ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر عرض کیا: السلام علیک یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: وعلیک ورحمۃ اللہ!'' پھر پوچھا: کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا بنوغفار سے ہوں! آپ نے یہ سُن کر اپنا دستِ مبارک چہرہ پر رکھ لیا، مجھے خیال ہوا کہ میرے غِفاری ہونے کو آپ نے ناپسند فرمایا ہے؟ میں نے آپ کا ہاتھ چہرہ سے ہٹانے کی کوشش کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے روک دیا ــــ یقیناً وہ مجھ سے زیادہ اُن کے مرتبہ شناس تھے ــــ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سر اُٹھا کر مجھ سے دریافت فرمایا: کب سے یہاں ہو؟ میں نے عرض کیا: کوئی ایک ماہ سے! پوچھا: ''پھر کھانا کس کے ہاں کھا رہے ہو؟'' عرض کیا: سوائے زم زم کے اتنے دنوں سے میرا اور کوئی کھانا نہیں ہے! لیکن اسی پانی کی برکت سے فربہ بھی ہو گیا ہوں اور مجھے بالکل بھوک کا احساس نہیں ہوتا، فرمایا: ''زم زم بہت مبارک پانی ہے اور وہ بہترین غذا وشفا ہے'' پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اجازت لی کہ وہ مجھے آج رات اپنے گھر کھانا کھلائیں گے، آپ نے اجازت دے دی، پھر ہم تینوں وہاں سے روانہ ہوئے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دروازہ کھولا، اور ہمارے لئے طائف کے کشمش پیش کئے، تیس روز کے بعد یہ پہلا کھانا تھا جو میں نے تناول کیا۔

دونوں واقعات میں کافی تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں اس تضاد کو دُور کرنے کی سعی فرمائی ہے، اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ بعثتُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطلاع پا کر اس کی تحقیق کرنا طلب علم ہی ہے، اس علم کی خاطر سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا سفر کرنا اور ان ساری مشقتوں اور مجاہدوں کو گوارا کرنا وغیرہ جتنی باتیں واقعات میں نظر آ رہی ہیں سب قابلِ عبرت ہیں، اور یہ جاننے کے لئے کافی ہیں کہ راہِ علم راہِ مشقت ہے، طالبانِ علومِ دینیہ نے ہمیشہ ان مشقتوں کو گوارا کیا اور سینہ سے لگایا ہے، ہمیں بھی اپنے اندر یہی جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔

● سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں عوالیٔ مدینہ میں اُمیہ بن زید رضی اللہ عنہ کے محلے میں رہتا تھا، میں نے اپنے ایک انصاری پڑوسی کے ساتھ معاملہ طئے کر کے باری مقرر کر لی تھی کہ ایک دن وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر رہ کر آپ کے ارشادات محفوظ کریں اور رات میں آ کر مجھے سنائیں، اور ایک دن میں آپ کی خدمت میں حاضر رہوں اور رات بستی پہونچ کر دن بھر کی سیکھی ہوئی باتیں انہیں سُناؤں، اس طرح ہم دونوں گویا روزانہ ہی آپ کی تعلیمات سے بہرور ہوتے تھے، محروم نہ رہتے تھے۔

● اس سے زیادہ عجیب ولطیف حضرت جابر بن عبداللہؓ کا واقعہ ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی کہ ملکِ شام میں ایک صحابی ہیں جنہوں نے ایک حدیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنی ہوئی ہے جو میں نے کسی اور سے اُن کے حوالے سے سُن رکھی تھی، مجھے شوق ہوا کہ میں انہی سے براہِ راست سماعت کرلوں چناں چہ میں نے سواری اور سامانِ سفر تیار کیا اور ملکِ شام کے لئے چل پڑا، ایک مہینے کی مسافت طئے کر کے وہاں پہونچا اور صحابیٔ رسول کے بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ صحابی عبداللہ بن اُنیسؓ ہیں، میں اُن کے گھر پہونچ گیا، خادم سے کہلوایا کہ دروازے پر جابر آیا ہوا ہے، انہوں نے دریافت کروایا، کیا جابر بن عبداللہ؟ میں نے کہا: ہاں! تو وہ فوراً گھر سے باہر تشریف لائے، مجھے گلے سے لگایا؛ میں نے عرض کیا میں راستے تمام دعا کرتا رہا کہ ہم دونوں میں سے کسی کی بھی موت نہ ہو اور اس سے قبل ہماری ملاقات ہوجائے تاکہ میں اس حدیث کی اُن سے سماعت کرسکوں، پھر انہوں نے اسی وقت مجھے وہ حدیث مکمل سُنا دی، اس صراحت کے ساتھ کہ اُنہوں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اِسے سُنا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے حضرت جابرؓ کے واقعے کو نقل کرنے کے بعد فرمایا: اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے کیسا تعلق اور اُن کے سیکھنے کا کتنا شوق رکھتے تھے؛ نیز امام احمدؒ کا ایک ملفوظ بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ حصولِ علم کے لئے کسی بڑے عالم کی مستقل صحبت اختیار کرلینا بہتر ہے یا علاقوں علاقوں میں گھوم پھر کر مختلف علماء سے علم حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے، فرمایا: بڑے بڑے علماء تک سفر کر کے پہونچنا ان کی صحبت اختیار کرنا اور اُن سے استفادہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

● حبرُ الامۃ، امامُ الائمہ، اور صحابیٔ جلیل حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو میں جوان تھا، یعنی زیادہ عمر نہ تھی، میں نے ایک انصاری نوجوان ساتھی سے کہا: آؤ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحابِ کرام سے دین کی باتیں پوچھیں اور علم حاصل کرلیں، کیوں کہ وہ آج بڑی تعداد میں موجود ہیں، (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو وفات پاگئے، رفتہ رفتہ یہ لوگ بھی ختم ہوجائیں گے) تو ساتھی نے مجھ سے کہا: اے ابن عباسؓ! کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگ علم کے بارے میں تمہارے محتاج ہوں گے جب کہ صحابہ کرامؓ میں ایک سے ایک علم وفضل والے موجود ہیں؛ یہ کہہ کر انہوں نے اس میں دلچسپی نہ لی، اور میں ایک ایک صحابیؓ کے پاس جاتا اور ان سے جو کچھ معلوم کرسکتا تھا معلوم کرتا رہا، حتیٰ کہ اگر مجھے پتہ چلتا کہ فلاں صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک حدیث موجود ہے تو میں خود ان کے پاس جاتا انہیں زحمت نہ دیتا، اُن کے انتظار میں اپنی چادر اُن کے دروازے پر ڈال کے پڑ جاتا، ہوائیں گرد وغبار میرے چہرے پر اُڑاتی رہتیں، جب وہ صحابی باہر آتے تو مجھے

دیکھ کر حیران ہوجاتے اور کہنے لگتے: اے رسول اللہ کے بھتیجے! کیسے آنا ہوا؟ آپ ہمیں بلا لئے ہوتے ہم خود آپ کے پاس حاضر ہوجاتے، میں عرض کرتا: نہیں! میرا ہی حق تھا کہ میں آپ کے پاس آتا، کیوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فلاں حدیث سُنی ہوئی ہے، میں چاہتا ہوں کہ میں خود آپ کی زبان سے وہ حدیث سُن لوں، (بہرحال! اس طرح میں احادیثِ شریفہ کا علم حاصل کرتا رہتا اور دن رات ایک کر دیتا) پھر ایک دن آیا کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کم ہوتے چلے گئے اور طالبانِ علمِ نبوت میرے گرد جمع ہونے اور مجھ سے علم سیکھنے لگے؛ تب اُن نوجوان ساتھی کو بات سمجھ میں آئی اور میرا یہ حال دیکھ کر کہنے لگے، یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقل مند تھا۔

امام حاکم ؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ حدیث علمِ دین کی طلب وشوق اور محدثین واساتذہ کے غایتِ احترام کی دلیل ہے۔

● حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں: لوگوں کو اعتراض ہے کہ ابوہریرہ ؓ ہی اتنی حدیثیں کیوں بیان کرتا ہے، اتنے سارے مہاجرین وانصار موجود ہیں وہ لوگ اتنی کثرت سے حدیثیں کیوں نہیں بیان کرتے ہیں؟ اگر قرآن کریم کی یہ دو آیتیں میرے سامنے نہ ہوتیں تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا، (مگر میں کیا کروں کہ) اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں ''بے شک وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، باوجود یہ کہ ہم اُنہیں کتاب میں کھول کھول کر لوگوں کے لئے بیان کر چکے ہیں، تو ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔ ہاں وہ لوگ جنہوں نے توبہ کر لی ہو اور اپنی اصلاح کر لی ہو اور (چھپائی ہوئی باتوں کو) کھول کھول کر بیان کر دیا ہو تو میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہوں، اور میں توبہ قبول کرنے کا خوگر، اور بڑی رحمت والا ہوں۔'' (البقرہ:۱۵۹، ۱۶۰)

(اصل میں بات یہ ہے کہ) ہمارے مہاجر بھائی بازاروں میں خرید وفروخت کرنے میں اور اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے اور ہمارے انصاری بھائی (اپنی کھیتی باڑی اور باغ بانی کے) کاموں میں گھرے رہتے تھے، اور ابوہریرہ ؓ ان مشاغل سے فارغ ہونے کی بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چمٹا رہتا تھا، اس لئے میں جس قدر حاضر باش تھا وہ لوگ اتنا رہ نہیں پاتے تھے اور میں جس قدر احادیث محفوظ کر پاتا تھا وہ لوگ اس قدر نہیں کر پاتے تھے۔

حافظ ابن حجر ؒ اس حدیث کی تشریح کی بعد فرماتے ہیں: حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا اور دنیوی مشاغل کی کمی حصول علم اور حفاظتِ علم میں بہت مؤثر و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ---------- (بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

اصلاحی مضامین

اقرأ سے جو رشتہ ٹوٹ گیا۔۔۔۔

8 ستمبر عالمی یوم خواندگی کی مناسبت سے

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

ہم تاریخ کے سبھی ادوار کھنگال کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی انسان کی معاشرتی زندگی میں بگاڑ غالب رہا اور اصلاح کے بہت کم آثار دیکھنے کو ملے؛ اسی مجموعی بگاڑ کے نتیجہ میں قومیں زوال پذیر ہوئیں اور اپنے انجام کو پہنچیں۔ ہر ذی شعور و صاحب ادراک اس بات سے ضرور اتفاق کرے گا کہ قوموں کی صلاح و فساد میں تعلیم و خواندگی کا بڑا دخل ہے، تعلیم ہی انسان کو انسان بناتی ہے اور زیورِ تہذیب و تمدن سے آراستہ کرتی ہے، جو قومیں تعلیم میں پیچھے رہ جاتی ہیں وہ اقوام عالم میں اپنا مقام نہیں بنا پاتیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلم اور عرب علماء نے سائنس اور طب کے میدانوں میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جسے آج بھی مغربی دنیا اپنی ارتقائی کوششوں کے باوجود فراموش نہیں کر سکی اور نہ آئندہ کر سکتی ہے۔

ابن سینا کی طبی تصنیف ''القانون'' جسے انگریزی میں کینن لکھا جاتا ہے، آج بھی میڈیکل لائبریریز کے ریفرنس سیکشن میں موجود ہوتی ہے۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں ہیں کہ ہمارے اجداد نے علم و حکمت سے سرخروئی پائی؛ مگر ہماری نئی نسل تن آسانی کا شکار، سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ کو علم کے حصول کا ذریعہ سمجھنے لگی، گوگل کو بطور حوالہ بیان کیا جانے لگا، کتابوں سے دوری نے نئی نسل کو زیور تعلیم سے محروم اور نظریاتی طور پر برہنہ کر دیا۔ یہ بھی تعلیم کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ جب ہمارے جوان فکری سرمایہ سے خالی ہوں گے تو گمراہ کن افکار کی یلغار ان کے قلوب و اذہان کو تباہ و برباد کر دے گی، اس کے نتیجے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ چشم عالم سے پوشیدہ نہیں۔

آج مغرب کی ترقی کا راز صرف تعلیم کو اہمیت دینا اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔ اسی تعلیم کے بل پر انہوں نے پوری دنیا کو فتح کیا ہے، مغرب کی کامیابی اور مشرق کے زوال کی وجہ بھی تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ دنیا کے وہ ممالک جن کی معیشت تباہ ہو چکی ہے ان کا دفاعی بجٹ تو اربوں روپے کا ہے، مگر تعلیمی بجٹ نہ ہونے کے برابر ہے، یہی ان کی بربادی کا بنیادی ہے۔

---

*استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

عالمی یوم خواندگی:

8 ستمبر کا دن ہر سال یوم خواندگی کے طور پر منایا جاتا ہے، جیسے ۸ نومبر 1965ء کو یونیسکو میں ایک قرارداد کے تحت منظور کیا گیا، سب سے پہلے اقوام متحدہ (UNO) کے ذیلی ادارے یونیسکو نے 1965ء میں اس کو منانے کا فیصلہ کیا تھا؛ لیکن کسی سبب سے پہلا یوم خواندگی یونیسکو کی زیر نگرانی 1966 میں منایا گیا۔اس کے بعد ہر سال یہ دن عالمی سطح پر منایا جانے لگا۔ وطن عزیز میں بھی یہ دن جوش وخروش سے منایا جاتا ہے، اس دن کو منانے کا مقصد افراد، برادریوں اور سماجوں میں خواندگی کی اہمیت پر زور دینا اور جہالت کی تاریکیوں کا قلع قمع کرنا ہے۔ بین الاقوامی یوم خواندگی پر ہر سال یونیسکو، بین الاقوامی سماج کو خواندگی کے موقف اور تعلیم بالغان کے بارے میں یاد دلاتا ہے۔ یہ تقاریب دنیا بھر میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی جانب سے منائی جاتی ہیں۔ یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ تعلیم ہی سے تعمیر سیرت، تعمیر ملت اور ماہرین کی فراہمی ممکن ہوسکتی ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں نے بھی تعلیم وتربیت کی اہمیت اور افادیت کو جانا اور اپنی نسل نو کو علم کی شمع سے روشن اور منور کیا وہ قومیں ترقی کے زینے طے کرتی ہوئی عروج تک پہنچ گئیں؛ جن میں امریکہ، برطانیہ، چین، فرانس، جاپان، جرمنی، اور دوسرے ممالک شامل ہیں اور جن قوموں نے تعلیم پر توجہ نہیں دی وہ قومیں تاریکی کی راہ پر چلتے ہوئے انتشار کا شکار ہوگئیں۔ جیسے صومالیہ، نائیجیریا اور ایتھوپیا، وغیرہ۔ یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان میں ناخواندہ افراد کی ایک بڑی تعداد ہے اور اسی ناخواندگی نے ہمارے جمہوری نظام کو درہم برہم اور سماجی سطح کو کمزور کردیا ہے۔

دورِ حاضر میں دیگر شعبوں کی طرح مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی کا گراف بھی تشویش ناک حد تک قابل فکر ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق بہ حیثیتِ مجموعی مسلمان ہندوستان میں نہایت پسماندہ ہیں، نہ تو معاشی طور پر مضبوط ہیں اور نہ ہی سماجی طور پر دیگر قوموں کے مقابلہ میں بلند معیار ہیں، رہا مسئلہ تعلیم کا تو تعلیم کے علمبردار ہونے کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی نہایت درجہ تشویش ناک ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں عموماً یہ تصور عام رہا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو زیادہ تر مذہبی تعلیم ہی دلواتے ہیں؛ لیکن سچر کمیٹی نے اس حقیقت کو بھی واشگاف کیا کہ مسلمانوں کے صرف چار فی صد بچے ہی دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ اعداد وشمار صرف عام لوگوں کے لیے ہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے لیے بھی کسی المیہ سے کم نہیں کہ ہندوستان میں صرف چار فی صد مسلم بچے دینی تعلیم کے حصول میں کوشاں ہیں جب کہ آبادی کے تناسب سے یہ اعداد وشمار کم از کم ۵۰ فی صد تو ہونے چاہئیں۔لیکن مسلمان عصری تعلیم تو کجا، دینی تعلیم میں بھی پسماندگی کا شکار ہیں۔

سچر کمیٹی کی رپورٹ میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اجزا کا جب ہم تحلیلی جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ہندوستان کی مجموعی آبادی کے لحاظ سے عصری درسگاہوں، اسکولس، کالجز اور یونی ورسٹیز میں ہماری تعداد انگلیوں پر گنے جانے کے لائق ہے۔ ہندوستان کی مجموعی شرح خواندگی حالیہ مردم شماری کے مطابق ۶۵ ٪ فی صد ہے۔ مسلمانوں میں یہ شرح ۵۹ ٪ فی صد ہے جب کہ ہندو ۶۵ ٪ فی صد، عیسائی ۸۰ ٪ فی صد، سکھ ۶۹ ٪ فی صد، بدھ ۷۲ ٪ فی صد اور جین ۹۴ ٪ فی صد کے ساتھ تعلیمی میدان میں سب سے آگے ہیں۔ مسلمانوں میں مردوں کی شرح خواندگی ۶۸ ٪ فی صد اور عورتوں کی شرح خواندگی ۵۰ ٪ فی صد ہے، جو کہ متذکرہ بالا شمار کرائے گئے دیگر مذاہب کی شرح خواندگی سے بہت ہی کم ہے۔

مستند ذرائع کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں مسلم طلبہ کے اندراج کی شرح، قومی شرح 23.6 فیصد، سے بہت کم ہے 2000 سے 2010 کے ختم تک اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں مسلم طلبہ کے ناموں کے اندراج کا فیصد 5.2 سے بڑھ کر 13.8 فیصد ہوا۔ اس کے برعکس دیگر پسماندہ طبقات کا تناسب 22.1 فیصد درج فہرست ذاتوں کا 18.5 صد رہا۔ اعلیٰ تعلیم کے کورسیس سے متعلق کل ہند سطح پر کئے گئے سروے 15-2014 کے مطابق ہندوستان کی آبادی میں مسلمان 14 ٪ فیصد ہیں؛ لیکن اس قدر کثیر آبادی کے حامل ہونے کے باوجود اعلیٰ تعلیمی اداروں میں صرف 4.4 فیصد مسلم طلبہ نے اپنے نام درج کروائے ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت پچھلے 50 برسوں میں مزید ابتر ہوئی ہے۔

یہ غور وفکر کا مقام ہے کہ جس مقدس دین کی بنیاد ہی تعلیم و تعلم پر ہو اور جس کے آخری پیغمبر معلمِ کائنات ﷺ کے فرامین اور اُن پر نازل شدہ قرآن کریم کی بے شمار آیات تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرے، آخر کیوں اُسی مذہب کے ماننے والے تعلیم کے میدان میں افسوسناک حد تک دیگر مذاہب سے اس قدر پیچھے ہیں؟؟؟

جو پہلا سبق تھا کتابِ ھدیٰ کا:

مفکر اسلام علی میاں ندویؒ لکھتے ہیں: عرب کے ایک خشک علاقہ میں ایک پہاڑ پر جو نہ بلند تھا اور نہ سرسبز، تقریباً چودہ سو سال پہلے ایک واقعہ پیش آیا تھا اور جس نے تاریخ انسانی ہی نہیں بلکہ تقدیر انسانی پر ایسا گہرا اور لازوال اثر ڈالا ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، اور جس کا اس لوح وقلم سے خاص تعلق ہے جس پر علم وتہذیب اور تحقیق وتصنیف کی اساس ہے اور جس کے بغیر نہ یہ عظیم دانش گاہیں وجود میں آتیں اور نہ یہ وسیع کتب خانے جس سے دنیا کی زینت اور زندگی کی قدر وقیمت ہے، میری مراد پہلی وحی کے واقعہ سے ہے، جو ۶ اگست ۶۱۰ء کے لگ بھگ نبی عربی محمد ﷺ پر مکہ کے قریب غارِ حرا میں نازل ہوئی، اس کے الفاظ یہ تھے: اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ

الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾ (اے محمد!) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو! جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تمہارا پروردگار کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

خالق کائنات نے اپنی وحی کی اس پہلی قسط اور بارانِ رحمت کے اس پہلے چھینٹے میں بھی اس حقیقت کے اعلان کو مؤخر اور ملتوی نہیں فرمایا کہ علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے، غارحرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبی اُمّی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود بھی نہیں سیکھا تھا جو قلم کے فن سے یکسر واقف نہ تھا، کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے؟ اور اس بلندی کا تصور بھی ہوسکتا ہے کہ اس نبی اُمّی پر ایک اُمت اُمّی اور ایک ناخواندہ ملک کے درمیان (جہاں جامعات اور دانش گاہیں تو بڑی چیز ہیں، حرف شناسی بھی عام نہ تھی) پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے اور آسمان وزمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے، تو اس کی ابتداء ہوتی ہے اِقۡرَاۡ سے، اس کی ابتدا اُعۡبُدۡ سے نہیں، اس کی ابتداء صَلِّ سے نہیں بلکہ اس کی ابتداء ہوتی ہے اقرأ سے۔

جو خود پڑھا ہوا نہیں تھا، اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ پڑھو! یہ گویا اشارہ تھا اس طرف کہ آپ کو جو اُمت دی جانے والی ہے وہ اُمت صرف طالب علم ہی نہ ہوگی بلکہ معلّمِ عالم اور علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی، جو دور آپ کے حصہ میں آیا ہے وہ دور اُمّیت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دور ترقی کا دور ہوگا۔

مولانا علی میاںؒ کے یہ معنی خیز اور فکر و درد سے لبریز الفاظ ہمیں میدان علم وعمل میں آگے بڑھنے اور حالیہ ابتر صورت حال پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اپنا شان دار و بے مثال ماضی رکھنے والی حق پرست قوم اگر تعلیم کے سلسلہ میں اس درجہ پس روی کا شکار ہوگی تو دیگر اقوام کی طرح نشان عبرت وموعظت بن جائے گی۔ اقبال مرحوم نے اسی پر یوں مرثیہ خوانی کی ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

قانونی معلومات

رائٹ آف سیلف ڈیفینس یعنی اپنے دفاع کا حق

از: مفتی محمد نوید سیف حسامی ایڈووکیٹ*

قانون؛ ہر شہری کو کسی یقینی خطرہ یا غیر قانونی حملہ کے مقابلہ میں اپنی جان، آزادی یا اپنی جائیداد اور مال و متاع کے دفاع کا بھرپور حق دیتا ہے، دنیا کے تقریباً ہر قانون میں اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے، تعزیرات ہند (انڈین پینل کوڈ ۱۸۶۰ء) کی دفعات ۹۶ یا ۱۰۶ میں رائٹ آف سیلف ڈیفینس پر بحث کی گئی ہے، ان دفعات میں ان عوامل کا ذکر کیا گیا ہے جن کی موجودگی میں ایک شخص کو اپنے دفاع کا حق ملتا ہے، نیز حملہ کو روکنے کے لئے کتنی طاقت کے استعمال کی اجازت ہے اور اس طاقت کے استعمال کے نتیجہ میں مدمقابل کا جانی یا مالی نقصان ہوتا ہے یا جان ہی چلی جاتی ہے تو یہ دفاع کرنے والے کے حق میں ''جرم'' کے زمرہ میں نہیں آتا ہے، موجودہ حالات کی مناسبت سے زیر نظر مضمون میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ''حق دفاع خود اختیاری'' کو تعزیرات ہند کی دفعات کی روشنی میں مثالوں ونظیروں کے ساتھ واضح وسہل انداز میں ذکر کیا جائے کہ معلومات حوصلہ بخشتی ہیں اور ناواقفیت بزدلی پیدا کرتی ہے۔

یہ قانون بنیادی طور پر دو اصولوں کے تابع ہے:

۱) ہر شخص کو اپنی جان یا اپنی جائیداد نیز کسی اور فرد کی جان اور جائیداد کے دفاع کا حق حاصل ہے بشرطیکہ حملہ کے علاوہ اس وقت دفاع کی کوئی اور شکل موجود نہ ہو۔

۲) یہ حق انتقامی طور پر کسی کو نقصان پہونچانے کے لئے وضع نہیں کیا گیا ہے، دوسرے الفاظ میں اس کو یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ''یہ حق ڈھال کے مانند ہے تلوار کے مانند نہیں''۔

دفعہ ۹۶، ۹۷: دفعہ ۹۶ دفاع کے حق ہونے کو بتاتی ہے جبکہ دفعہ ۹۷ میں حق دفاع کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے کہ ''ہر فرد کو ہر ایسے جرم سے خود کو یا کسی اور کو بچانے کا حق حاصل ہے جو جسم کو نقصان پہونچاتا ہو نیز چوری سے، ڈکیتی سے، نقصان رسانی سے، مجرمانہ طور پر جائیداد میں دخل اندازی سے یا ان جرائم کی کوششوں سے جائیداد کے دفاع کا حق بھی حاصل ہے چاہے وہ جائیداد اپنی ہو یا کسی اور کی، منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔۔۔۔

*جنرل سکریٹری دینی تعلیمی بورڈ، کریم نگر

مثلاً زید نے رات کے وقت دیکھا کہ کچھ لوگ اس کی دکان کا تالہ توڑنے کی کوشش کررہے ہیں، حالانکہ ابھی تالہ کھلا نہیں ہے اور وہ لوگ دکان میں داخل نہیں ہوئے ہیں تب بھی زید کو اپنی دکان کی حفاظت میں ان پر حملہ کرنے کی اجازت ہے، زید کا یہ عمل جرم کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

دفعہ ۹۸: کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ مخبوط الحواس، فاتر العقل، پاگل شخص کے خلاف بھی دفاع کا حق حاصل رہے گا چاہے ان کا عمل جرم کے زمرے میں آتا ہو یا نہ آتا ہو، مثلاً زید نے پاگل پن کے زیر اثر عمرو پر قاتلانہ حملہ کیا، عمرو کو دفاع کا بھرپور حق ملے گا اگرچہ اس مثال میں زید اپنے پاگل پن کی وجہ سے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کررہا ہے (کیونکہ پاگل قانونا بھی مرفوع القلم ہے)، اسی طرح غلط فہمی، حملہ آور کا کم عمر ہونا، حملہ آور کا نشہ میں ہونا وغیرہ مقابل کے دفاع کے حق کو ختم نہیں کرتا ہے، مثلاً زید رات کے وقت ایک گھر میں داخل ہوا جس میں قانونی طور پر اس کو داخل ہونے کی اجازت ہے لیکن عمرو جو گھر میں تھا اس نے چور یا نقب زن خیال کرکے زید پر حملہ کردیا، ایسی صورت میں زید کو بھی دفاع کا حق ملے گا، نتیجہ میں کوئی ایک یا دونوں دوسرے کے حملہ میں زخمی ہوجائے تو کوئی بھی مجرم نہ ہوگا کیونکہ دونوں نے اپنے حق کا استعمال کیا ہے۔

دفعہ ۹۹: اس دفعہ کے تحت چار باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے:

۱) سرکاری ملازم (پولیس، محکمہ انکم ٹیکس، فوج وغیرہ) کے خلاف دفاع کا حق حاصل نہ ہوگا جب تک کہ مناسب وجوہات سے اس بات کا یقین نہ ہوجائے کہ ان کا عمل جو وہ کررہے ہیں یا کرنے کا ارادہ کررہے ہیں اس سے جان کا خطرہ یا شدید زخمی ہونے کا خطرہ ہے بشرطیکہ ان کا ارادہ نیک ہو اور ان کا عمل ان کے عہدہ کے اختیار میں ہو، مثلاً زید کے گھر انکم ٹیکس والوں نے دھاوا بولا اور گھر کی تلاشی لینے لگے، ان عہدیداروں کے اس عمل کے خلاف زید کو دفاع کا حق حاصل نہ ہوگا کیونکہ وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں اور اس عمل سے زید کو یا زید کے گھر والوں کو کسی شدید خطرے کا اندیشہ نہیں ہے، ہاں اگر سرکاری ملازم بھی اپنی حد پار کرے یا کرنے لگے جس کے نتیجہ میں مقابل اپنی زندگی کا یا سخت زخمی ہونے کا خطرہ محسوس کرے تو اس کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہوگا۔

۲) ایسا شخص جو سرکاری ملازم نہ ہو لیکن کسی سرکاری ملازم کے حکم پر عمل کررہا ہو اس کے خلاف بھی دفاع کا حق نہ ملے گا، اوپر ذکر کردہ تفصیل یہاں بھی ملحق کرلیں۔

۳) اُن معاملات میں دفاع کا حق نہ ملے گا جن میں متعلقہ عہدیداروں سے مدد لی جاسکتی ہو یا اپنے آپ کو سرکاری حکام کی مدد سے محفوظ کیا جاسکتا ہو، یعنی اتنا وقت یا اتنی مہلت ہو جس میں از خود دفاع کئے بغیر متعلقہ ذمہ داران سے تحفظ حاصل کیا جاسکتا ہو تو خود کو دفاع کا حق نہ ملے گا، اگر ایسے میں کسی نے اس مہلت سے فائدہ

اٹھانے کے بجائے خود دفاع کیا تو جرم کے دائرے میں آسکتا ہے۔

۴) دفاع کے حق کو استعمال کرتے وقت اتنے ہی نقصان کے پہونچانے کی اجازت ہے جتنے میں دفاع کا مقصد پورا ہوجاتا ہو، مثلاً حملہ آور کے گھٹنے پر وار کرکے اگر اسے آگے بڑھنے سے روکا جاسکتا ہو تو سر پر وار کرنا غلط ہوگا۔

دفعہ ۱۰۰: یہ اس باب کی اہم دفعہ ہے، اس دفعہ کے تحت ان اسباب وعوامل کا تذکرہ ہے جن کی موجودگی میں ایک فرد اپنے حق دفاع کو استعمال کرتے ہوئے حملہ آور کی جان بھی لے سکتا ہے یا اس کو شدید نقصان پہونچا سکتا ہے، اس دفعہ کے مطابق سات جرائم ایسے ہیں جن کے خلاف اپنی جان کے دفاع کا انتہائی حق حاصل ہوگا، وہ سات جرائم حسب ذیل ہیں:

۱) ایسا حملہ جس کی شدت ظاہر کرتی ہو کہ اگر اس کا دفاع نہ کیا جائے تو خود کی جان جاسکتی ہے۔

۲) ایسا حملہ جس کا دفاع نہ کیا جائے تو شدید زخمی ہونے کا اندیشہ ہو۔

۳) زنا بالجبر کی نیت سے حملہ کرنے والے کا دفاع۔

۴) خلاف فطرت شہوت پوری کرنے کی نیت سے کئے جانے والے حملہ کا دفاع۔

۵) اغوا کرنے کی نیت سے کئے جانے والے حملہ کا دفاع۔

۶) حبس بے جا میں رکھنے کی نیت سے کئے جانے والے حملہ کا دفاع بشرطیکہ اسباب وعوامل یہ بتاتے ہوں کہ دفاع کئے بغیر خارجی مدد کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۷) تیزاب کے حملہ سے بچنے کے دفاع میں حملہ آور کی جان لی جاسکتی ہے بشرطیکہ صورت حال یہ بتاتی ہو کہ بغیر دفاعی حملہ کئے خود کا تحفظ نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ بالا مواقع میں حملہ آور کی ''بالارادہ وبالقصد'' جان لینے والا قتل کا مجرم نہیں کہلائے گا، یہ بات واضح رہے کہ مذکورہ جرائم خود پر ہوں یا کسی اور پر، ہر دو صورت میں دفاع کا حق حاصل رہے گا، مثلا زید نے اپنے پڑوس میں دیکھا کہ ایک شخص دوسرے کو قتل کررہا ہے اور زید کو یقین ہے کہ فورا کوئی کاروائی نہ کی جائے تو قاتل کامیاب ہوجائے گا، ایسے میں دوسرے شخص کی جان بچانے کے لئے زید اگر پہلے فرد پر گولی چلائے یا شدید زخمی کرے تو زید مجرم تصور نہیں کیا جائے گا، ایسے ہی باقی مواقع پر غور کرلیا جائے۔

دفعہ ۱۰۱: دفعہ ۱۰۰ میں ذکر کردہ سات جرائم کے علاوہ کسی اور جرم کی صورت میں دفاع کرنے والے کو صرف زخمی کرنے کی حد تک دفاع کا حق حاصل ہوگا، اب سوال یہ ہے کہ چور سے بچنے کے چکر میں چور کی جان

چلی جائے تو وہ دفاع کے حق کے تحت آئے گا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دفعہ ۱۰۰ کے سات جرائم میں ''بالقصد و بالارادہ'' جان لینے کی اجازت ہے جبکہ دوسرے جرائم میں دفاع کرتے ہوئے جان بوجھ کر جان لینے کی اجازت نہ ہوگی، ہاں اگر بلاقصد و بلا ارادہ حملہ آور کی جان چلی جائے تب بھی وہ قتل کے زمرے میں نہیں آئے گا، مثلاً چوری دفعہ ۱۰۰ کے ذکر کردہ جرائم میں شامل نہیں ہے، لہذا چوری کے دفاع میں بالقصد جان لینے کی اجازت نہ ہوگی لیکن اندھیرے میں چور پر حملہ کرتے وقت ایسا وار چل جائے کہ اس کی موت واقع ہو جائے تو یہ حق دفاع کے تحت آئے گا، اگر چور نے بھی ہتھیار نکال لیا تو پھر یہ دفعہ ۱۰۰ کے تحت آ جائے گا۔

دفعہ ۱۰۲: اس دفعہ کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ دفاع کا حق کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے، اس دفعہ کے مطابق جیسے ہی خطرہ کا احساس ہو اور خطرہ کی معقول وجوہات پائی جائیں اور تحفظ کا کوئی راستہ نہ ہو تو دفاع کا حق شروع ہو جاتا ہے اور خطرہ ٹلنے تک رہتا ہے، خطرہ ٹلنے کے بعد اب دفاع کا حق باقی نہیں رہتا، مثلاً گھر کے سامنے ایک شخص ہتھیار ہاتھ میں لئے مالک مکان کو یہ دھمکی دے رہا ہو کہ وہ اسے گھر میں گھس کر ختم کر دے گا، اس دھمکی کو سن کر مالک مکان کو دفاع کا حق مل جائے گا لیکن کچھ دیر بعد وہ حملہ آور چلا جائے اور نہتا ہو کر دوبارہ وہاں سے گذرے اور مالک مکان کو اس کے نہتا ہونے کا یقین بھی ہو تو چونکہ مالک مکان کے لئے دفاع کا حق ختم ہو چکا ہے لہذا اس شخص پر کسی بھی قسم کا حملہ دفاع کے حق کے بجائے انتقام تصور کیا جائے گا جو کہ جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

دفعہ ۱۰۳: اس دفعہ کے تحت چار جرائم کی صورت میں جائیداد کے دفاع میں حملہ آور کی ''بالقصد و بالارادہ'' جان لینے کی اجازت ہوگی، چار جرائم یہ ہیں، (۱) ڈکیتی (۲) رات کے وقت نقب زنی (۳) انسانی استعمال میں موجود عمارت یا خیمہ میں آگ لگانا (۴) ایسی چوری یا غیر قانونی مداخلت جس کے تعلق سے یقین ہو کہ اگر دفاع نہ کیا جائے تو جان کا خطرہ ہے۔

دفعہ ۱۰۴: مذکورہ بالا چار جرائم کے علاوہ دوسرے جرائم کی صورت میں جان لئے بغیر دفاع کا حق حاصل ہوگا، ہاں جیسا کہ دفعہ ۱۰۱ میں ذکر کیا گیا کہ بالقصد اور بلاقصد کا فرق یہاں بھی رہے گا۔

دفعہ ۱۰۵: دفعہ ۱۰۲ کی طرح جائیداد کے دفاع کا وقت بھی جرم کے شروع ہونے سے ختم ہونے تک رہتا ہے، جرم ختم ہونے کے بعد دفاع کا حق نہیں ملے گا، مثلاً چور چوری کر کے چلا جائے تو اب اس کے پیچھے ہتھیار لے کر جانا کہ تلاش کر کے اس سے مال واپس لے لیا جائے یہ عمل حق دفاع میں نہیں آئے گا۔

(بقیہ صفحہ: ۴۲ پر)

نقوشِ رفتگاں

اور ذکر کی مجلس سونی ہوگئی............!

مفتی محمد عفان منصور پوری*

معرفت وسلوک کے امام، رہبر شریعت وطریقت، سادگی وزہد کے مرقّع ، یادگار اکابر، سرپرست مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، رکن مجلس شوری دارالعلوم دیوبند، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ کے خلیفہ وجانشین (پیر جی) حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی علیہ الرحمہ ۱۰ / ذوالحجہ ۱٤٤۰ھ مطابق ۱۲ / اگست ۲۰۱۹ء بہ روز پیر عید الاضحیٰ کے دن دوپہر پونے تین بجے میرٹھ کے آنند اسپتال میں تقریبا اسی برس کی زاھدانہ زندگی گزار کر واصل بحق ہوگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

اسی دن شب میں ٹھیک گیارہ بجے قبرستان حاجی شاہ کمال سہارنپور کے وسیع میدان میں قائد ملت اسلامیہ حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی دامت برکاتھم صدر جمعیت علماء ھند کی اقتداء میں ہزار ہاہزار افراد نے جنازہ کی نماز ادا کی اور پھر وہیں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

حضرت مولانا کا سانحہ ارتحال اس دور قحط الرجال میں عوام وخواص سب کے لئے بڑا خسارہ ہے۔ آپ نے اس مادی دور میں دنیا سے بے رغبتی اور رجوع الی اللہ کی جو نظیر پیش کی ہے وہ بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے، ہر دم فکر آخرت میں مستغرق رہ کر ذکر الٰہی سے زبان کو سرشار رکھنا آپ کا محبوب وطیرہ تھا، بلاشبہ آپ کی رحلت مجالس ذکر کو سونا کر گئی۔

آپ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے والد بزرگوار کے حلقہ ارادت کو نہ صرف سنبھالا بل کہ وسعت دی اور ان کی دینی راہنمائی وتربیت کا عظیم فریضہ انجام دیا۔

آپ خود بھی متبع سنت تھے اور دوسروں کو بھی سنت ہی پر عامل دیکھنا پسند کرتے تھے، خلاف سنت وضع قطع اختیار کرنے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے تھے، کسی ایسے شخص کا مجلس میں آجانا جس کے سر پر انگریزی بال ہوں اور چہرہ داڑھی سے خالی ہو آپ کو برھم کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا بھری مجلس میں اس پر سختی کے ساتھ نکیر فرماتے، بعض لوگوں کو آپ کا یہ عمل ناگوار بھی گزرتا لیکن بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں یہ بروقت تنبیہ دینی

* شیخ الحدیث وخطیب جامع مسجد امروہہ

انقلاب کا باعث بن جاتی۔

خانوادہ مدنی سے آپ کو بڑی قربت تھی اس لئے کہ آپ نے اپنے والد محترم اور شیخ الاسلام حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ دیرینہ مراسم اور گھر جیسے تعلقات کو خود دیکھا تھا۔

کچے گھر میں بچپن ہی سے ہمیں جانا یاد ہے ابتداء میں کبھی حضرت والد محترم مدظلہ العالی کے ہمراہ تو کبھی برادر بزرگوار دام اقبالہٗ کے ساتھ جب بھی حاضری ہوئی غیر معمولی تعلق کا آپ نے مظاہرہ فرمایا، پہلے سے آنے کی اطلاع ہو جاتی تو فون کر کے معلوم کرتے رہتے کہ کہاں پہونچے ہو، ہر مرتبہ پر تکلف ناشتہ کا اہتمام فرماتے، کھانے کا وقت ہوتا تو مجال ہے کہ بغیر کھانا کھائے چلے آئیں، اگر کسی اور کے یہاں کھانے کا وعدہ کر لیتے تو ناراضگی کا اظہار فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ تمہارے نانا سہارنپور میں کچے گھر کے علاوہ کہیں مہمان نہیں بنتے تھے اسلئے جب بھی آؤ اپنے گھر کی طرح کھانا یہیں کھاؤ، واپسی کے وقت اکثر و بیشتر کتب خانہ یحیوی کی مطبوعہ کتب، نقدی، عطر یا کوئی اور چیز بڑی محبت کے ساتھ بہ طور ہدیہ عنایت فرماتے اور دعاؤں سے نوازتے۔

گذشتہ سالوں میں کتب خانہ کے قیام اور بکری پالن کی بڑی ترغیب دیتے تھے اس کے طریقہ کار کو سمجھاتے اور فوائد کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے، متعدد مرتبہ با قاعدہ فون کر کے اس سلسلہ میں پیش قدمی کرنے کی ھدایت بھی دی اپنے ممکنہ تعاون کا بھرپور یقین دلایا لیکن ہماری طرف سے سستی رہی اور ان دونوں کاموں میں سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔

خاکسار کی مجلس نکاح میں خسر محترم حضرت مولانا سید رشید الدین صاحب حمیدی نور اللہ مرقدہ کی خاص دعوت پر آپ کی مرادآباد تشریف آوری ہوئی، بعد فراغت نکاح مجھے ایک طرف کو بلایا اور ارشاد فرمایا کہ نکاح کے بعد مجھے حضرت والد صاحب (شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ) نے ایک نصیحت فرمائی تھی میں نے اس پر عمل کیا اور اس کے فوائد محسوس کئے میں تمہیں بھی وہی بتانا چاہتا ہوں نصیحت یہ ہے کہ: جب اہلیہ سے ملاقات ہو تو اولا دو رکعت نفل نماز اس طرح پڑھنا کہ تم امام ہو اور بیوی مقتدی بعد ازاں دونوں رشتے کے مبارک ہونے اور جملہ خیرات و برکات کے سلسلہ میں دعاء کرنا انشاء اللہ بہت نفع ہوگا، بندہ نے اس پر عمل کیا اور اس کے خوشگوار اثرات آج تک باقی ہیں اور انشاء اللہ باقی رہیں گے۔

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ اپنی معصومیت، بے نفسی، بزرگی اور للّٰہیت کے حوالہ سے ہمیشہ یاد کئے جاتے رھیں گے۔

آپ پیر جی کے نام سے معروف تھے خود اس لقب کی وجہ بیان فرماتے ہیں: "ایک مرتبہ اپنے کتب خانہ

یحیوی پر بیٹھا کھیل کھیل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو بیعت کر رہا تھا، اتنے میں حضرت مدنیؒ کا تانگہ آگیا، حضرت تانگہ سے اترے اور مجھے بیعت کرتے دیکھا تو فرمایا کہ ''مجھے بھی بیعت کرلیں'' میں نے بلا تکلف کہہ دیا کہ آیئے اور حضرت مدنی کو بیعت کرلیا اس کے بعد سے حضرت مدنیؒ مجھے ''پیر صاحب'' ہی کہہ کے پکارتے اور ایک طرح سے یہ میرا لقب بن گیا''

خاندان کے چھوٹے بڑے سب آپ کو ماموں کہا کرتے تھے ممانی سے آپ کو بڑا لگاؤ تھا اور ان کا بہت خیال بھی رکھتے تھے، تقریبا سوا برس پہلے ان کے وصال کے بعد سے تو بہت ٹوٹ گئے تھے اور خاموش خاموش رہنے لگے تھے۔

ممانی جو خود ولی صفت خاتون تھیں ضعیفی اور معذوری کے باوجود ماموں کی پوری نگرانی اور ان کی ضروریات کا بھرپور خیال رکھتی تھیں وقت پر دوا کھلانا، پرہیزی کھانے کا انتظام کرنا ان کی صحت کا خیال رکھنا وغیرہ، متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ باہر مجلس لگی ہوئی ہے حضرت گفتگو فرما رہے ہیں لوگ گوش برآواز ہیں زنان خانہ سے بچیاں آئیں اور دور کھڑے ہوکر آواز دی: ماموں!''ممانی کہہ رہی ہیں بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہوگئی، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، آرام کرلو'' حضرت مسکراتے ہوئے جواب دیتے اچھا کہہ دو آرام کررہے ہیں پھر کبھی لیٹ جاتے اور کبھی نیم دراز ہوجاتے۔ اللہ اکبر! آپسی تعلق اور احترام رائے کی یہ مثالیں کہاں ملتی ھیں؟

باری تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور انبیاء وصدیقین شھداء وصالحین کے زمرے میں شامل فرمائے۔ آمین

(بقیہ صفحہ ۳۹ سے)

دفعہ ۱۰۶: اس سلسلہ کی آخری اور اہم دفعہ میں اس نکتہ پر بحث کی گئی ہے کہ اگر جان کا دفاع کرتے وقت یہ محسوس ہو کہ کوئی معصوم بھی دفاعی حملہ کی زد میں آسکتا ہے تو کیا دفاع کا حق استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تعزیرات ہند میں اس مسئلہ کو ایک دلچسپ مثال سے واضح کیا گیا ہے، مثال کے مطابق اگر زید پر کوئی بھیڑ قاتلانہ حملہ کرتی ہے اور اس بھیڑ میں معصوم بچے بھی ہیں اور زید اپنے دفاع کا حق گولی چلائے (یا اندھا دھند تلوار پھرائے) بغیر استعمال نہیں کرسکتا ہے اور زید کے اپنے حق کے استعمال کی صورت میں اگر کوئی معصوم مرجائے یا کسی معصوم کو نقصان پہونچ جائے تو زید کا یہ عمل جرم کے دائرے میں نہیں آئے گا، حالانکہ وہ معصوم صرف بھیڑ کا حصہ تھے حملہ آور نہیں تھے۔

نقوشِ رفتگاں

حضرت شیخ یونس جونپوریؒ کی صحبتِ بافیض کی کچھ یادیں کچھ باتیں

یہ مضمون حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی دامت برکاتہم استاذ تفسیر وحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کا بیان ہے، جسے دار الحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ، گجرات نے حضرت کی اجازت سے محفوظ کیا، اور مرتب کرکے افادۂ عام کے لئے ارسال کیا ہے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

محدث کبیر، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری رحمۃ اللہ علیہ پر بہت کچھ لکھا گیا۔ حضرت کی شایان شان لکھا گیا، لکھا جارہا ہے، اوران شاء اللہ لکھا جاتا رہے گا۔ بندۂ ناچیز کو بفضلہٖ تعالیٰ حضرتؒ کے ساتھ رہنے کا کئی مرتبہ موقع ملا۔ کچھ باتیں جو ظاہر میں بہت چھوٹی ہیں لیکن امید ہے کہ اس سے بہت سے لوگوں کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا، اس نیت سے عرض کردیتا ہوں۔

حضرت شیخ یونسؒ کی خدمت میں پہلی دفعہ حاضری

۱۹۸۴ جب بندہ عربی دوم میں پڑھتا تھا تو استاد محترم حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی مدظلہٗ کی برکت سے حضرت شیخ یونس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے محبت ہوئی۔ ۱۹۸۶ء-۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنے سبق میں فرمایا تھا کہ گجرات سے دو طالب علم میرے پاس کماحقہٗ پڑھ کر گئے، ایک عبداللہ اور دوسرا اسماعیل۔ عبداللہ سے مراد حضرت مفتی عبداللہ صاحب ہانسوٹی دامت برکاتہم اور اسماعیل سے مراد حضرت الاستاذ مولانا اسماعیل چاسوی صاحب۔ حضرت الاستاذ درس میں یہ بات کچھ اس انداز سے بیان فرماتے تھے کہ مجھے عربی دوم ہی سے حضرت شیخ یونس صاحبؒ سے محبت ہوگئی تھی اور دل میں بے اختیار یہ داعیہ پیدا ہوا کہ ان سے ہی مجھے بیعت ہونا چاہیے۔ اور آئندہ سال میں رمضان گذارنے سہارنپور پہنچا۔

اس سے ایک بات یہ سیکھنے کو ملی کہ اساتذہ اپنے تلامذہ کے سامنے اکابرین کا تذکرہ کیا کریں اور ان کے واقعات سنایا کریں۔ اس کی برکت سے اکابرین سے عقیدت وتعلق پیدا ہوگا۔

ایک پلیٹ سے دوسری پلیٹ میں کھانا منتقل کرنے کا عمدہ طریقہ:

حضرت پیر جی مولانا محمد طلحہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ مہمانوں کے لئے تیار کی جانے والی پلاؤ کی دیگ سے ایک پلیٹ حضرت مولانا یونس صاحبؒ کو پہنچائی جائے، یہ خدمت بندے کو ملی۔ جب پہلے دن حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ تجھے میری پلیٹ میں کھانا منتقل کرنا آتا ہے؟ میں نے معروف طریقے سے کھانا منتقل کیا۔ تو فرمایا کہ اس طرح نہیں، لاؤ! میں تمہیں کھانا کیسے منتقل کرنا ہے؛ سکھاتا ہوں۔ پھر حضرت نے اپنے حجرے کی پلیٹ منگوائی، پھر کہا کہ باہر ہینڈ پمپ (Hand-Pump) لگا ہوا ہے وہاں جاؤ! اور تھوڑی دیر چلاتے رہنا تاکہ جمع شدہ پانی نکل جائے، پھر جب صاف پانی آئے تب میری پلیٹ دھولو۔ پھر فرمایا کہ تم جو خانقاہ سے پلیٹ لائے ہو اس کے اوپر میری پلیٹ رکھ دو، پھر اس کو پورا اُلٹ دو۔ تاکہ ہاتھ اور چمچ کچھ لگانا نہ پڑے اور سب کے سب چاول بیک وقت منتقل ہوجائیں اس طرح چاول منتقل کرنے کا بہترین، عمدہ اور محتاط طریقہ جس میں ایک دانہ بھی نیچے نہ گرے، حضرت شیخؒ نے مجھ چھوٹے سے طالب علم کو سکھایا۔ اور ہینڈ پمپ سے فوراً پانی نہ استعمال کیا جائے بلکہ تھوڑا پانی چلا جائے تاکہ صاف پانی آنے لگے، یہ بھی سیکھنے کو ملا۔

روٹی کی کشتی نہ بناؤ؛ سالن کے اسراف پر تنبیہ:

ایک دفعہ ہم حضرت کے ساتھ میں کھانا کھا رہے تھے تو جیسا کہ معمول ہے روٹی کا ٹکڑا توڑ کر کشتی بنا کر زیادہ شوربا لے کر کھایا جاتا ہے۔ میں بھی اسی طرح روٹی کے ٹکڑے کو کشتی بنا کر سالن کھانے لگا تو حضرت نے فوراً متنبہ فرمایا کہ یہ غلط طریقہ ہے، اس طرح نہیں کھانا چاہیے، اس میں سالن زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ سالن کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ روٹی نرم ہوجائے اور حلق سے اترنا آسان ہوجائے۔ اس طرح شوربا کثیر مقدار میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کھانے میں بھی حضرتؒ نے میری اصلاح فرمائی۔

محدثِ کبیر باہر استنجا خانے جاتے تھے:

اس زمانے میں حضرت شیخؒ دارِ قدیم میں مقیم تھے اور بلا مبالغہ میں کہتا ہوں کہ حضرت کا حجرہ، حجرہ نہیں تھا بلکہ ایک کتب خانہ تھا۔ چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں، اور ایک چھوٹا پرانا قدیم انداز کا حجرہ اور اسی حجرے میں حضرت کا قیام رہا کرتا تھا۔ اور اس وقت حجرے کے اندر استنجا خانہ بھی نہیں تھا۔ حضرت اتنے بڑے محدث ہونے کے باوجود باہر استنجے کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اور حضرت شیخ یونسؒ:

دورہ سے فراغت والے سال جب میں اپنے پیر و مرشد و استاذِ محترم حضرت اقدس مولانا مفتی محمود حسن

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے جانے لگا تو دیکھتا تھا کہ حضرت شیخؒ اتنے بڑے محدث ہونے کے باوجود جمعرات کے دن سہارنپور سے سفر کرکے دیوبند تشریف لاتے۔ اور اس وقت بس میں سفر کرتے تھے اور دیوبند بس اڈے پر اتر کر رکشا میں چھتہ مسجد میں تشریف لاتے اور حضرت کی مجلس میں برابر تشریف فرما ہوتے اور بعض مرتبہ طالب علمانہ انداز میں بعض سوالات بھی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور انہوں نے شیخؒ سے حدیث کے متعلق کچھ پوچھا تو حضرت شیخؒ کا یہ جملہ تھا کہ ہم تو حضرت اقدسؒ کے سامنے ایک طالب علم جیسے ہیں اور ہم حضرت سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ یہ روایت کہاں ملے گی؟ غرض یہ کہ اتنے بڑے محدث ہونے کے باوجود اس طرح بس اور رکشہ میں آنا اور پھر طالب علمانہ حاضری دینا؛ یہ عاجزی و تواضع بڑی سیکھنے کی بات ہے۔

تراویح میں کثرتِ تلاوت پر خوشی کا اظہار:

ایک دفعہ ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کی خانقاہ میں رمضان میں بھی حضرت شیخؒ کی تشریف آوری ہوتی۔ تیسرے عشرے میں کتب خانہ نعمانیہ کے مالک حضرت مولانا طیب صاحبؒ جو شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے خلیفہ تھے، وہ اکیلے تراویح میں قرآن مجید سناتے تھے۔ پہلے دو تین دن حضرت مولانا طیب صاحب چار یا پونے چار پارے سنا دیتے تا کہ ۲۹ کو ختم کرنا آسان ہو جائے۔ تو حضرت شیخ یونس صاحبؒ بہت خوش ہوتے مولانا طیب صاحب کو مبارک باد دیتے کے ماشاء اللہ آج تو آپ نے پونے چار پارے کے قریب تلاوت فرمادی۔ اور خانقاہ میں مختلف حفاظ دوسرے عشرے میں تراویح میں قرآن سناتے، حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈو دامت برکاتہم کی ایک ترتیب تھی کہ جو مختلف حفاظ خانقاہ میں آتے تھے، دوسرے عشرے میں سب لوگ تراویح پڑھائیں تا کہ سب لوگ قرآن یاد رکھیں اور یاد کرنے کی توفیق ہو۔

وتر میں مسنون قراءت:

وتر کی نماز بھی؛ جو تراویح کی اخیری چار رکعت پڑھائے اسی کے ذمے ہوتی۔ وتر میں اگر کوئی مسنون قراءت نہ پڑھے تو حضرت شیخ مولانا یونس صاحبؒ کی طبیعت پر بہت ناگواری ہوتی۔ اور ایک دن تو آپ نے مائک لے کر سنت کی اتباع اور مسنون قراءت کے متعلق بیان کیا۔ سخت لہجے میں بیان کیا اور فرمایا کہ سورۂ اعلیٰ، سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص کو وتر میں پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ حضرت کی خانقاہ عالمی ہے، فیض عالمی ہے، اگر یہاں پر سنت قراءت کا رواج عام ہوگا تو پورے عالم میں یہ فیض عام ہوگا۔

حضرت کے ساتھ پہلا حج:

ایک مرتبہ حضرت کے ساتھ پورا حج کرنے کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ اس وقت مکہ مکرمہ میں بنک بیڈ (Bunk Bed) تھے یعنی ایسی چارپائیاں تھیں اوپر نیچے دو حصوں میں سو سکیں تو ذمہ داروں کی طرف سے تقسیم یوں ہوئی کہ شیخؒ چارپائی کے نیچے والے حصے میں اور مجھے اوپر والے حصے میں سونا ہے۔ مجھے اوپر جانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی لیکن قانون کے حساب سے چارپائی پر سونا لازم تھا اور شیخ کے حکم سے میں مجبوراً اوپر جا کر سویا کرتا تھا اور بہت سہما سہما رہتا تھا کہ کہیں میرے پلٹنے اور حرکت کرنے کی وجہ سے حضرت کے آرام میں کچھ خلل نہ آئے، بارہا میں نے دیکھا کہ حضرت لیٹ جاتے، چادر اوڑھ لیتے اور لوگوں کو یوں لگتا کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں، لیکن طبیعت میں علالت اور کمزوری کے باوجود حضرت لیٹے لیٹے ہی بارہ تسبیح کا ذکر پورا فرما لیتے، کبھی تلاوت کرتے۔ حضرت مکۃ المکرمۃ کے قیام کے دوران مناسک کے متعلق مختلف حدیث کی کتابیں زیر مطالعہ رکھتے۔ حضرت شیخ مولانا محمد یونس صاحبؒ ہمیشہ ہی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے یہاں تک کہ رمضان میں بھی کبھی کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہیں، کبھی تلاوت قرآن میں۔

منیٰ کا منظر:

غالباً حج کے چھ یا سات اسفار میں حضرت کے ساتھ منیٰ میں رہنے کا موقع نصیب ہوا۔ ایک حج تو مستقلاً اور اس کے علاوہ برادر مکرم مولانا یونس صاحب رندیر کے طفیل میں حضرت کے ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ حضرت بہت استقامت کے ساتھ ۱۳؍ ذی الحجہ کو بھی منیٰ ہی میں مقیم رہتے تھے اور رمی کر کے تشریف لاتے تھے۔ مولانا بدرالدین صاحب اجمل ۱۲؍ کی شام کو حضرت نبی کریم ﷺ کے نام کی قربانی کرتے اور اس کو پکوا کر بہترین انداز میں رات کو منیٰ میں بھیجتے تھے۔ اور اس کھانے سے ہم سب محظوظ ہوتے۔ حضرت تو چند لقمے ہی کھاتے، باقی کھانے سے ہم لوگ ہی فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور بعد میں شیخ کے انتقال کے بعد والے سال خود مولانا بدرالدین اجمل منیٰ میں موجود تھے۔ لیکن آب دیدہ ہو کر فرمانے لگے کہ یہ تو شیخؒ کی برکت تھی۔ اس سال میں خود مکہ میں موجود ہوں لیکن میرے لیے نظم کرنا مشکل ہوا کہ میں منیٰ کے اندر کھانا پکوا کر منگواؤں۔ حضرت شیخؒ ہی کی برکت تھی کہ ۱۲؍ کی شام کو قربانی بھی ہوتی تھی اور تازہ بکرا پک کر منیٰ میں آتا تھا۔ اور منیٰ میں قیام کے دوران ہم نے دیکھا کہ مستقلاً حدیث کا درس جاری رہتا تھا۔ عرب طلبہ آتے تھے اور ۳-۴ دن کے اندر پوری پوری کتاب آپ پڑھا دیا کرتے تھے اور منیٰ کہ ان دروس میں ہمیں بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ عرفات کے روز مجھے حکم فرمایا کہ چند منٹ خطبۂ حجۃ الوداع کا خلاصہ سنا دو تا کہ نبی کریم ﷺ کا اتباع ہو جائے۔ میری دعا اور

تقریر سن کر فرماتے: تبلیغ والے تیرا انداز بہت پسند کریں گے۔ تجھے پکڑ کر تبلیغ میں لے جائیں گے۔

دینی اعتبار سے بنجر بستیوں میں ایمان کی فکر:

اللہ کے فضل و کرم سے جب نورانی مکاتب کا سلسلہ قائم ہوا، تو پنچ محل کے علاقے سے بھی حضرت شیخؒ کو کارگزاری پہنچی تھی کہ وہاں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے لیکن اب تک کوئی مکتب، مدرسہ، عبادت گاہ قائم نہیں ہوئی ہے اور اب بات یہاں تک آ گئی کہ لوگ مرتد ہو رہے ہیں تو حضرت بھی اس سلسلے میں نہایت متفکر رہتے تھے۔ جب حضرت کے سامنے یہ حالات آئے تو حضرت ہی کے حکم سے حضرت کے ایک خاص مسترشد حاجی اسماعیل صاحب جو ساؤتھ افریقہ میں رہتے ہیں، انہوں نے عزم کر لیا کہ میں ان مکاتب کے لیے مصارف دوں گا۔ تو بھائی مولانا یونس صاحب رندیرا مقیم مدینہ منورہ کی وساطت سے ان ساؤتھ افریقہ والے اسماعیل بھائی نے مالی تعاون کا سلسلہ شروع کیا اور پنچ محل کے علاقے میں مکاتب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس وقت پنچ محل علاقے کا جو زون ہے وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کی برکت سے قائم ہوا ہے۔ پھر جب بھی ملاقات ہوتی تو حضرت بہت اطمینان سے پنچ محل کے علاقے کی کارگزاری مجھ سے سنتے اور بعض مرتبہ حضرت روتے، خوب روتے اور حضرت کی آنکھوں سے آنسو نکلتے، کہ دیکھو ایسی ایسی بنجر بستیاں ہیں کہ جہاں مسلمان آباد ہیں لیکن اب تک کوئی کلمہ نماز سکھانے کا انتظام نہیں ہے۔ جب حضرت کو ہم کارگزاری سناتے کہ اب الحمد للہ وہاں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، تو حضرت خوش ہوتے، دعائیں دیتے اور اس سے آپ رونے لگ جاتے تھے۔

غرض یہ کہ پنچ محل کے علاقے میں ہمارے نورانی مکاتب کا سلسلہ حضرت ہی کی برکت ہے جس میں اب تک گودھرا شہر کے اطراف میں تقریباً ۵۰؍ مکاتب قائم ہو چکے ہیں، اس میں بہت بڑی تعداد طلباء و طالبات کی ہے جو قرآن کریم ناظرہ مکمل کر چکی ہے اور اب وہ دار العلوم میں حافظ یا عالم بننے کے لیے جا رہے ہیں۔

ہانسوٹ مدرسے میں ختم بخاری شریف کا ایک منظر:

ایک مرتبہ ہانسوٹ حضرت نور اللہ مرقدہ بخاری شریف کے درس کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے بخاری کے درس کے اخیر میں کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے وجد میں آکر پر کیف اور روح پرور انداز میں دل کی کتنی گہرائیوں سے لفظ ''اللہ'' ارشاد فرمایا۔ مجمع کے ہر ایک فرد کے دل میں ''اللہ اللہ'' کا ذکر جاری ہو گیا۔ میں تو ایک بہت ہی چھوٹا انسان اور بہت پیچھے بیٹھا ہوا تھا لیکن پیچھے تک پورے مجمع کے دل کے اندر اللہ اللہ کے ذکر کی کیفیت جاری ساری ہو گئی۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیسا قلبی ربط اور کیسی آپ کے قلب کے اندر ذکر کی کیفیت ہو گی۔ اس محفل کی عجیب لذت آج تک میں اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ

اپنا صحیح اور حقیقی عشق ہم سب کو نصیب فرمائے۔ یہ ہمارے اکابر کی خصوصیت تھی کہ ایک طرف علمِ حدیث کے امام اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی گہرائی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے والا بنائے۔ آمین

کھروڈ میں ختم بخاری شریف:

ایک موقع پر کھروڈ میں ختم بخاری کے لیے حضرت شیخؒ تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت کے درس سے پہلے میرے مشفق حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ نے بہت مختصر اور جامع تقریر پیش فرمائی جس کا عنوان یہ تھا ''مغلیہ سلطنت کے دور میں کچھ ایسے لوگ اقتدار پر آئے جن میں بے دینی بہت تھی لیکن پھر ایک وقت آیا کہ اورنگ زیب جیسے بہت ہی دینی فکر اور دینی حمیت رکھنے والے بادشاہ آئے۔ تو کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی صحبت کی برکت تھی۔'' یہ کہہ کر عوام کو اللہ والوں کی صحبت کی اہمیت سمجھا رہے تھے۔ اس درمیان حضرت مولانا عبداللہ صاحب نے حضرت مولانا یونس صاحبؒ کی ایک بات نقل فرمائی کہ آج صبح صبح تہجد کے وقت حضرت شیخ مولانا یونس صاحب فرمانے لگے کہ حدیث شریف کے اندر آئی ہوئی حفاظت کی دعائیں اور اوراد ظاہر میں لوگوں کو چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کو پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ بڑے بڑے حادثات اور فتنوں سے حفاظت فرماتے ہیں۔ تو حدیث میں آئی ہوئی حفاظت کی مسنون دعائیں اگرچہ سائز اور مقدار میں چھوٹی ہیں لیکن ان کے فوائد اور ثمرات بڑے عظیم الشان ہیں، اس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

غیر مسلم کو ایمان کی دعوت:

حضرت شیخ یونس صاحبؒ نے ایک مرتبہ اپنے سفر کی کارگذاری سنائی کہ حضرت ٹرین میں سفر فرما رہے تھے۔ اڑوس پڑوس والے کسی غیر مسلم سے پہچان ہوئی۔ حضرت سوچنے لگے کہ میں ان کو توحید کی دعوت دوں تو کس طریقے سے دوں۔ دورانِ سفر ان لوگوں نے مجھ سے اچھا سلوک کیا تو ان کے سلوک کا بہترین بدلہ یہ ہے کہ میں ان کو توحید کی دعوت دوں۔ تو سوچتا رہا کہ کیسے دعوت دوں تو فوراً میرے ذہن کے اندر سورۂ یوسف کی آیت آئی یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ پھر میں نے اسی آیت کی روشنی میں ان کو توحید کی دعوت پیش کی۔

دیکھیے ہمارے اکابرین کو جہاں موقع ملا تو دوسرے مذہب والوں کو توحید کی دعوت دینے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں کی۔ ایک غیر مسلم نے حسن سلوک کیا تو اس کے ساتھ بہترین حسن سلوک یہ ہے کہ اس کو توحید کی دعوت دی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحید کی دعوت کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔ آمین

فقہ وفتاویٰ

نماز سے متعلق چند احکام

از: مولانا مفتی ندیم الدین قاسمی*

نماز میں شریک ہونے والے کا اپنی ثناء مکمل کرنا

سوال: امام صاحب کے تکبیر کہنے کے بعد ایک شخص نماز میں شریک ہوا جیسے ہی اس نے ثناء پڑھنا شروع کیا فوراً امام نے قرأت شروع کر دی تو کیا شریک ہونے والا شخص اپنی ثناء پوری کرے یا امام کی قرأت سنتے ہی خاموش ہو جائے؟

جواب: اگر جہری نماز ہو تو امام کے قرأت شروع کر دینے پر مقتدی کو ثناء وغیرہ کا سلسلہ ختم کر دینا چاہئے اور اگر سری نماز ہو تو مقتدی ثناء کو مکمل کرے۔ (مستفاد از: احسن الفتاویٰ: ۳/ ۳۸۲)

سنن ومستحبات میں امام کی اتباع

سوال: مقتدی کے لئے سنن ومستحبات میں امام کی اتباع کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو مقتدی اگر امام کے بائیں طرف سلام پھیرنے سے پہلے مقتدی دوسرے سلام سے بھی فارغ ہو جائے تو مقتدی کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

جواب: سنن ومستحبات میں امام کی اتباع کرنا فرض وواجب نہیں ہے بلکہ بدرجہ سنت اور مستحب ہے، لہٰذا اگر امام کے بائیں طرف سلام پھیرنے سے پہلے مقتدی دوسرے سلام سے فارغ ہو جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی البتہ بلا عذر ترک سنت کی وجہ سے مقتدی کا یہ فعل مکروہ تحریمی ہوگا۔ (فتاویٰ قاسمیہ: ۷/ ۱۳۳)

کسی آدمی کا ہاتھ اُٹھائے اور باندھے بغیر امام کے ساتھ رکوع میں چلا جانا

سوال: ایک شخص نماز میں اس وقت شریک ہوا جب امام حالتِ رکوع میں تھا، آنے والے شخص نے رکوع پانے کے لئے بلا ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور بغیر باندھے رکوع کر لیا تو کیا ایسی صورت میں شریک ہونے والا کی نماز درست ہو جائے گی؟

جواب: اگر آنے والے شخص نے قیام (کھڑے ہونے) کی حالت میں تکبیر تحریمہ کہی تو ایسی صورت میں

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

بغیر ہاتھوں کو اٹھائے اور بغیر باندھے رکوع میں جانے کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی بلکہ صحیح ہوگی اس لئے کہ کانوں تک ہاتھ اٹھانا مسنون ہے فرض وواجب نہیں ہے۔(فتاویٰ قاسمیہ ۳۸/۷)

مقتدی کا امام سے پہلے سجدہ کرنا

سوال: اگر مقتدی امام سے پہلے سجدہ میں چلا جائے تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

جواب: اگر مقتدی امام سے پہلے سجدہ میں چلا جائے تو اگر مقتدی کے سر اٹھانے سے پہلے امام بھی سجدہ میں چلا جائے تو ایسی صورت میں مقتدی کی نماز درست ہوجائے گی اور اگر امام کے سجدہ میں جانے سے پہلے مقتدی سر اٹھائے تو مقتدی کی نماز فاسد ہوجائے گی، ہاں البتہ اگر یہ مقتدی امام کے ساتھ دوبارہ سجدہ کا اعادہ کر لیتا ہے تو پھر درست ہوجائے گی۔(فتاویٰ قاسمیہ: ۱۴۱/۷)

قاعدہ اولیٰ یا اخیرہ میں شریک شخص کے تشہد مکمل ہونے سے پہلے امام کا کھڑا ہو جانا یا سلام پھیر دینا

سوال: ایک آدمی قعدہ اولیٰ میں شریک ہوا تشہد شروع بھی نہیں کیا تھا کہ امام صاحب تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے تو اب وہ کیا کرے؟ تشہد پڑھے یا امام کی اقتداء میں کھڑا ہوجائے؟

جواب: قعدۂ اولیٰ میں شرکت کرتے ہی امام کھڑا ہوجائے تو وہ تشہد پڑھ کر ہی کھڑا ہو تشہد پڑھے بغیر امام کی اقتداء میں کھڑا ہونا مکروہ تحریمی ہے۔(فتاویٰ قاسمیہ: ۱۴۹/۷)

عورتوں کا نماز میں ٹخنے ملانا

سوال: عورتوں کو نماز میں اپنے دونوں ٹخنے ملانا مسنون ہے یا مرد کی طرح چار انگل کا فاصلہ رکھنا مستحب ہے؟

جواب: حدیث پاک میں آپ ﷺ نے عورتوں کو رکوع، سجدہ اور جلسے وغیرہ میں اعضاء کو ایک دوسرے سے ملا کر ارکان کی ادائیگی کا حکم فرمایا ہے تو اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قیام کی حالت میں ٹخنوں کو ٹخنوں سے ملا کر کھڑے ہوجانا چار انگلی فاصلہ رکھنے کے مقابلہ میں بہتر ہے۔(فتاویٰ قاسمیہ: ۲۹۲/۷)

عورت کا ساڑھی پہن کر نماز پڑھنا

سوال: عورتوں کا ساڑی پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے مکروہ ہے یا نہیں؟

جواب: اگر ساڑھی سے پورا ستر چھپ جائے تو نماز درست ہے البتہ جہاں غیر مسلم عورتوں کا مخصوص لباس سمجھا جاتا ہو تو وہاں ساڑھی پہننا مطلقاً مکروہ ہے خواہ نماز میں ہو یا خارجِ نماز میں۔(فتاویٰ قاسمیہ: ۳۳۰/۷)